

اُردو مشتوی کارتقا

عبدالقادر سروری

ای جو کیشل بک ہاؤس علی گڑھ



اردو مشوی کا ارتقاء

پروفیسر عبد القادر سروری



[جَدِيد (يُدْبِشْ)]

پروفیسر عبدالقادر سروی

امپریشنل بک ہاؤس

مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گلڈھ ۲۰۲۰ء

جملہ حقوق محفوظ

ایڈریشن ————— 2004

قیمت ————— 30/-

کتابت : ریاض احمد، لا آباد
مطبع : ایم-۱۔ے۔ پرنسپل طبع دہلي



ایچ بی بی ایشنل بکس ہاؤس

مسلم نوین رٹی مارکیٹ علی گڑھ

۲۰۰۰۳

دیباچہ طبع دوئم

اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کو شایع ہوئے کوئی چالیس برس کا عرصہ ہو گیا۔ اس دوران قدیم اور متوسط عہد کی متنوں میں کئی اور منظر عام پر آئیں۔ اس کے علاوہ مجموعی طور سے کتاب پر نظر ثانی کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن میری اپنی دوسری مصروفیتوں کے سبب سے اس کا موقعہ نہ مل سکا۔

ہند اور پاکستان کی کئی یونیورسٹیوں میں داخلِ نصاب ہونے کی وجہ سے اس کی مانگ تھی۔ چنانچہ بعض ادارے، فاصل طور پر پاکستان میں اسی حالت میں چھاپنے کو مھر لئے لیکن مجھے اس کی نظر ثانی کے بغیر، کتاب کو اسی حالت میں دوبارہ طبع کرنے میں ممانعت نہیں معلوم ہوتا تھا۔

اسی اثناء میں ایجوکلیشن بک ہاؤس علی گڑھ سے اس کو چھاپنے کی اجازت کے لئے خط آیا۔ میں نے اس پر نظر ثانی ضروری سمجھی اور کچھ مزید اضافوں کے ساتھ یہ دوسری ایڈیشن مرتب کیا اور مجھے توقع ہے کہ اس ترمیم کے ساتھ یہ کتاب اردو ادب کے طلباء اور عام قارئین کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو گی۔

پوٹ گریجویٹ شعبہ اردو
جموں کشمیر یونیورسٹی (سرنگر)

عبدالقدیر سرائی

مورخ ۲۳ فروری ۱۹۶۸ء

دیباچہ طبع اول

اردو اور فارسی شاعری میں مثنوی کی صفت، بیانیہ اور توضیحی شاعری کے لئے مخصوص ہے۔ رزم اس کا مہتمم بالشان موضوع ہے، لیکن ڈرامائی شاعری کے اجزا بھی اس میں ضمناً شامل ہو جاتے ہیں۔ فارسی شاعری میں اس کے محل کے مخصوص حالات کے لحاظ سے موضوع کا تنوع بھی کافی موجود ہے۔ لیکن اردو مثنوی کے پس منظر کی بڑی حد تک یکسانیت کی وجہ سے شعرا کے موضوع محدود رہے۔ چند قدیم رزمیہ مثنویوں مثلاً نصرتی کے "علی نامہ"، رستمی کے "فادر نامہ" اور حسن شرقی کے "ظفر نامہ" کو جھوٹ کر بعد کے زمانے میں رزمیہ مثنویاں بہت کم لکھی گئیں اور ان کی بڑی تعداد قصوں پر مشتمل ہے۔ عام مطالعہ کرنے والوں کی درسترس میں پورا ذخیرہ نہیں ہے، اور جو کچھ موجود ہے اس کو وہ قصوں اور داستانوں کا ناقابل امتیاز ڈھیر سمجھتے ہیں۔

ہمارے اسلاف کی ادبی کاوشوں کو بیسویں صدی کے ادبی معیاروں سے جانچنا آسان ہو گیا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس پر تعمیری تنقید کی کافی گنجائش ہے۔ اور اس سرمایہ کو ہم اپنے آئندہ ادب کے الہان میں کئی طرح معاون بنائے ہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ اس کے کسی ایک یا زیادہ بہملوؤں سے ناراض ہو کر ہم اس سے اپنے تعلقات منقطع کر لیں۔ بعض وقت دوسری قوموں کے لکھنے والوں مثلاً ۱۹۱۶ء کی جنگِ یورپ کے بعد فرانسیسی ادیبوں نے ایسا کرنے کی کوشش کی، لیکن ذہنی فلبیجوں کو پاٹنے والی فطرت انہیں اسلاف کی طرف کھینچ کر لے ہی گئی۔

واقع یہ ہے کہ اردو مثنوی، مختلف زمانوں میں اپنی معین رفتار کے اندر بھی ادبی خیالات میاروں اور اسالیب زبان کا کافی تنوع رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ظاہر ہے کہ یہ کارنامے اپنے ارددگرد کے حالات، مذاق اور معتقدات سے بے تعلق نہیں ہو سکتے۔

مثنوی ایک ادبی صنف کی چیزیت سے، اور ذاتی طور پر کسی تحدید کو روانہ نہیں رکھ سکتی۔ بلکہ جیسا کہ مولانا حآلی نے لکھا ہے، اردو شاعری کی تمام اصناف میں سب سے زیادہ بخار آمد یہی صنف ہے اور ہو سکتی ہے۔ اس میں ظاہری اور معنوی ہر اعتبار سے پلند پایہ شاعری کے تمام لوازم موجود ہیں۔ اس کی وضاحت کے لئے "شاہ نامہ" اور "مثنوی معنوی" کا نام لینا کافی ہے۔ اردو میں بھی "بوستان خیا" "سمراجیان" اور "گلزار نسیم" اپنی نوعیت کے رہنے والے کارنامے ہیں۔ مثنوی رزمیہ نہ بھی ہوتا بلکہ بھی شعر کے لازوال عناصر تک اس کی رسائی ممکن ہے۔ اس طرح اردو مثنوی کا خصوصی مطالعہ دلپیسی سے فالی نہیں۔ اس کے بنیادی حرکات غزل اور قصیدہ یا کسی دوسری صنف شاعری سے بالکل مختلف ہیں۔ اسی لئے اس کے علیحدہ مطالعہ سے شاعر کے تخیل کی مکمل تصویر کو دھکا لگنے کا در نہیں۔ مثنوی خود ایک مکمل تصویر ہوتی ہے۔

اردو مثنوی کے ارتقادر کا مطالعہ ایک اور طرح پر بھی ضروری ہے۔ اردو قصہ گرنی کی شکلوں اور اسالیب کے ارتقادر کا مطالعہ، مثنوی کے مطالعہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ قدیم زمانے سے سرکھڑو کے دور تک جتنے قصے اردو میں لکھے گئے، وہ منظوم اور سب کے سب مثنوی میں ہیں۔ اردو مثنویاں موضعی کے اعتبار سے، اگر یا اردو قصہ گرنی کی تاریخ کے ابتدائی ابواب ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ سلسل خیال، مر بوط بیان اور کسی خاص موضع اور مسئلے کو اس کے ارتقائی منازل تک پہنچانے میں شعار کی ذہانت جو پیرائے اور فنی طریقے اختیار کرتی ہے اس کا مطالعہ کرنا ہر توہمارے لئے اردو کے طویل شعری کارناموں کے تفصیلی مطالعے کے بغیر

چارہ نہیں۔ اور یہ کارنامے، مرنیوں کو چھوڑ کر سب کے سب مشنوی کی شکل میں ملتے ہیں۔

یہی حرکات تھے، جو دراصل اس مختصر کتاب کے لکھنے کا باعث ہوتے، لیکن موجودہ صورت اختیار کرنے سے دو سال پہلے، اس کا ابتدائی خاکہ ابن نشاطی کی "پھولبن" جملب اشاعت دکھنی مخاطرات حیدر آباد کن کی طرف سے شایع ہوئی ہے، کے مقدمہ کے طور پر شروع کیا گیا تھا، بعد میں یہ حصہ خود اتنا ضخم ہو گیا کہ اس کو علیحدہ کتاب کی صورت میں شایع کرنا مناسب سمجھا گیا۔

اس میں اردو مشنوی کی پیدائش سے لے کر موجودہ زمانے تک اس کی ترقیوں اور تبدیلیوں کی مختصر تنقیدی تاریخ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر عہد کے عام رحمانوں اور خصوصیتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو مشنریاں عام طور پر دسترس میں ہیں، ان کے اقتباسات دینا تھیل حاصل تھا۔ لیکن قدیم مشنریوں میں سے اکثر ابھی تک شایع نہیں ہوئی ہیں۔ اور جو ابھی ابھی چھپی ہیں وہ عام طور پر شایع نہیں ہوئیں۔ اس لئے ایسی مشنریوں کے اقتباسات بھی پیش کئے گئے ہیں۔ اس کی وجہ سے زبان اور انداز بیان کی جو تبدیلیاں ابتداء سے اس وقت تک ہوتی رہی ہیں، وہ نظر کے سامنے رہیں گی۔ اس طرح یہ چھوٹی سی کتاب اردو شاعری کی ایک اہم صنف کی ارتقائی تاریخ بھی ہے اور زبان کی عہد بہ عہد ترقی کے مطالعوں کا دیباچہ بھی۔ امید ہے کہ یہ اردو زبان اور ادب کے متعلیمین کے لئے مفید اور دلچسپ ثابت ہو گی۔

جامعہ عثمانیہ۔ حیدر آباد کن

یکم فروری ۱۳۶۹ھ / ۱۹۴۹ء

عبد القادر سروری

فہرست مضمایں

۱۔ شنوی کا مقام اصناف شعر میں	۱۱
۲۔ اردو شنوی کے اولین نمونے	۲۳
۳۔ طویل تر شنویاں	۳۲
۴۔ قدیم شنویوں کا عروج	۳۸
۵۔ بجا پور کی شنویاں	۵۸
۶۔ گولکنڈہ کی شنویاں	۷۵
۷۔ دکن میں مغلیہ عہد کی متصرفانہ شنویاں	۸۹
۸۔ دورِ متوسط کی ابتدائی شنویاں	۱۰۲
۹۔ شنوی اپنے عروج پر	۱۱۸
۱۰۔ شنوی جدید دور میں	۱۴۰ تا ۱۴۶

شنوی کا مقام اصناف شعریں

ہماری شاعری میں سب سے اہم صنف شنوی کی ہے، کیوں کہ اس میں ایک وسیع مفہوم اور مربوط خیال کے نشوونما کی گنجائش ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شعر کی کوئی صنف بھی ہو، بذاتِ خود غیر اہم نہیں سمجھی جاسکتی۔ اچھائی اور برائی صناع میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک باکمال شاعر پیش پا افتادہ اصناف کو بھی اپنی وجدانی قابلیت کی دستیاری سے بلند کیوں کی انتہا تک پہنچا سکتا ہے۔ اردو شاعری کی کچھ صنفیں جیسے غزل، قصیدہ اور رباعی بہت مقبول صنفیں رہی ہیں اور اچھے اور بدے ہر طرح کے شعرا کی اتنے طویل عرصہ تک بطور خاص زمینش رہ چکی ہیں اور ان کے اصلی اور بنیادی موضوعات کے اتنے وسیع پہلو طبع آزمائی کے مرکز رہ چکے ہیں کہ اب ایک اعلیٰ صناع کے لئے بھی ان میں کمال پیدا کرنا، ذرا کٹھن ہی ہے۔ فکر بلند اور حسین اسالیب کے باوجود غزل کی صنف کے مخصوص موصوعات اور لوازم کی رعایت اور خود صنف کی شکل و صورت کی کیا نتیجت

جو غزل کا لازمہ ہے، پڑھنے والوں کے لئے کہ درت کا سبب بن جاتی ہے۔
 غزل گو شاعر، طبیعت کی انتہائی اتنی کے باوجود غزل کے بیان اور
 خاص طور پر اس کے اصلاحی لوازم اور روایات کو ٹھکرا نہیں سکتا۔ اسی لئے نئے موصفات
 پر طبع آزمائی کرتے ہوئے دہ استعارے سے کام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔
 لیکن اس کے مطالعہ کرنے والوں میں سے بہت کم اس کے اصلی مفہوم تک بہنچ
 سکتے ہیں، اور اکثر استعارے کو منزلِ مقصود تصور کر لیتے ہیں۔ اس سے پڑھنے والوں
 اور شاعر دونوں کا نقشان ہوتا ہے، لیکن یہ مجبوری ہے۔

قصیدے میں غزل کی وسعت بھی نہیں ہے اور شکل کی حد تک سراء نسبتاً
 زیادہ طویل ہونے کے، تمام صوری خصوصیات میں قصیدہ غزل کے مشابہ ہے۔ اسی
 لئے غزل کے قارئین کے لئے قصیدہ شکل کے اعتبار سے کوئی نئی چیز نہیں معلوم ہوتی۔
 یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ غزل کی شاعری ہو یا قصیدہ کی شاعری، شعری خیالات
 کے انہار کے لئے اصناف اور اشکال ہیں، یہی ساری شاعری نہیں ہیں۔ ان میں
 جو کچھ کہا جاسکتا ہے، کہہ کچنے کے باوجود، اور کچھ کھنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اور
 ”وسعت بیان کے لئے“ ”طرف تنگ نئے غزل“ کی شکایت کا لب پر آجانا ایک فطری
 بات ہے۔

ہماری شاعری پر یکسانیت اور روایت پرستی کے الزام کا ایک بڑا عنصر
 درحقیقت اصناف کی تجدید اور ان کی ضرورت سے زیادہ یا بندی پر عائد ہوتا

ہے۔ اس قید نے ہماری زبان کے بعض اعلیٰ فن کا رانہ قابلیتوں کو بھی پوری طرح برداشت کا راستہ نہیں دیا۔ اور آج روشن خیال نقادوں کو ہمارے قدیم شعرا کے افکار، ایک ناقابل امتیاز اجزا کا ڈھیر نظر آرہے ہیں۔

شنسی میں، کچھ تو اس وجہ سے کہ یہ صنف بہت زیادہ تکمیل مشرق نہیں بنی، اور کچھ اس کی نوعی وسعت کے سبب بڑی گنجائش رہی اور شاید ہمیشہ رہے گی۔ یہ درست ہے کہ فن ابتداء میں ایمانی اور علامتی اختصار کا حامل ہوتا ہے اور انتہا پر بھی، لیکن بعض علامتی اختصار ہی کو شاعری سمجھنا فکر انسانی کو بلا وجہ محدود کر دینا ہے۔ اسی لئے غزل کی علامتی شاعری کے بعد بھی، ذوق شعر کی تشکیل باقی رہتی ہے جو مر بوط، خیالی، ایک معین مقصد کے تحت واقعات نفس اللہ کی کے ترکیبی ارتقاء اور گوناگون منظاہر فطرت کی نقاشی اور اجزاء کا نات کی شاعرانہ توضیح اور تشریح سے پوری ہو سکتی ہے اور ان کے لئے شنسی بڑی سہولت کخش صنف ہے۔

قدیم شنسیوں میں کہنے کو تو ایک قصہ یعنی واقعات کا ایک گھٹا ہوا سلسلہ اور خیالی اور اکثر واقعات فرق نظری یا اخلاف قیاس افانہ ہو سکتا ہے، لیکن اس میں بھی واقعات کو جوڑنے، ان کو مر بوط کرنے اور ایک مطلب خیز انجام تک پہنچانے یعنی قصہ کے واقعات کے ارتقاء میں حیات کے بہت سے حسین اور قبیح پہلو آ جاتے ہیں۔ اسی میں ڈرامائی موقع پیدا ہوتے ہیں، بیانیہ اور مرقع

نگاری کی شاعری کی توضیحات، طبیہ شاعری کی سُنگفتگی، خزینہ شاعری کی اثر اندازی رزمیہ اور قصیدے کا طمطاق، غزل کی گھلاؤٹ، غرض سب کچھ اس میں سما سکتے ہیں۔ لیکن یہ اجزا اگر علمیہ علیحدہ اور تنہا پیش کئے جائیں تو حافظے اور ذوق کے لئے شاید اتنے موثر نہ ثابت ہوں اور وہ دلکشی کا سامان نہ رکھ سکیں جتنے کے وہ ایک مکمل کارنامہ کے ترکیبی عناصر بن جانے کے بعد رکھ سکتے ہیں، جس طرح ک تصویر کے انفرادی خاکے کے مقابلہ میں ایک ایسی تصویر زیادہ دلکشی رکھتی ہے جس میں ایک مکمل منظر اپنی تمام جزویات کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔ یہ جھپپی ہوئی بات نہیں ہے کہ ہماری زبان کے بعض ایسے شاعر جو صرف چند سو شعر کی صرف ایک متنوی سر انجام کر سکے، ہزاروں اشعار کے دیوان رکھنے والے شاعروں میں متعادل میں بھی زیادہ ممتاز ہو گئے ہیں اور اہمیت کے مالک بن گئے ہیں۔

لیکن یہ بات ضرور ہے کہ مرلوٹ خیالی، اطمینان قلب اور آسائش دماغ کی پیداوار ہے۔ جہاں یہ چیزیں مفقود ہوں شعرا کا ذہنی انتشار انہمار کے مناسب اور موزوں ذریعہ تلاش کر لیتا ہے۔ ایسے زمانہ میں جب کہ اطمینان قلب مفقود ہو، شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے جلد کہنا چاہتا ہے اور مختصر کہنا چاہتا ہے۔ چونکہ لمحات فرصت اور اطمینان قلب کے روام کا اس کو یقین نہیں ہوتا، اسی لئے وہ ہر موقع کو شاید آخری موقع سمجھتا ہے اور کسی طول طویل اور بیط تجویز

میں چہنس کر اپنے کام کو ادھورا چھوڑ جانے کے اتفاقات کا خطرہ وہ قبول کرنا نہیں چاہتا۔ اس کے پڑے بوڑھے، رجعت پسند تقاد اپنی طویل اور شاید خوشحالی کی زندگی کو نظر میں رکھ کر اس کی جلد بازی کے خلاف جو چاہیں کہہ لیں سیکن وہ اپنی نفسی اقتدار اور مقتضائے وقت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔

ہماری شاعری پر کچھ عرصہ بظاہر خوشحالی کا بھی گزرا ہے۔ مثلاً دن میں قرآن و سلطی کی خود مختار سلطنتوں، بجا پور اور گولکنڈے کا عہد، لکھنؤ میں آصف الدلہ اور ان کے جانشینوں کا زمانہ۔ یہ اردو شعرا کے لئے قدر دانی اور عروج کا زمانہ تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ کا عہد سیاسی تنزل کا زمانہ بھی تھا۔ یہ مختصر سے خوشحالی کے دور دو تباہیوں کا وسط تھے۔ بجا پور اور گولکنڈہ کی خود مختاری زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی اور لکھنؤ کی آبادی دلی کے تباہی برداشت شعرا سے ہوئی۔ ان کی اولاد جو باپ دادا کی مصیتوں سے ناواقف تھی اور جس کی آنکھ آصف الدلہ جیسے کہہ لٹ، ”نواب اور ان کے جانشینوں کے زمانہ میں کھلی تھی، اس موقع سے فائدہ اٹھاتی اور فطرت کے اتفاق کے مطابق عمل کرنا چاہتی ہے۔ اس کا تیسیجہ یہ تھا کہ اردو میں چند طویل کارنامے، چند مشنویاں اور شاید بلند پایہ مشنویاں معرض وجود میں آگئیں۔

اس دور سے آگے بڑھ کر جب ہم دن کے قدیم تر دور پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ خوشحالی اور سیاسی اور ادبی عروج کا زمانہ نظر آتا ہے۔ جس میں خاص طور پر

بیجا پور اور گولکنڈہ کی خود بخت ارسلانتوں کے سایہ عاطفت میں فکر و فن کو پہنچنے کا موقع ملا۔ بھمنی سلطنت ایک کافی طویل عرصہ کے امن و امان اور خوشحالی کے دور کے بعد زوال پذیر ہو گئی تو اس کی خاک سے پانچ ریاستوں کی تعمیر ہوئی جن میں بیجا پور اور گولکنڈہ اردو ادب کی خدمت کے اعتبار سے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سلطنتوں نے بھمنی دور کی تمدن روایات کے نشوونما کو جا رہی رکھا۔ اور اس طرح دس سے بارہویں صدی ہجری تک یہاں شاہستگی حسن کاری، ادب اور شاعری کا ارتقاء کم و بیش مسلسل رہا۔

بیجا پور اور گولکنڈہ کے حکمران علم و فضل، ادب، شاعری اور فنون لطیفہ کے نہ صرف بے مثل سر پرست تھے، بلکہ ان میں اکثر خود ادب، شعر اور فنون لطیفہ کا بلند پایہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ اسی لئے ان سلطنتوں کے استحکام کے ساتھ ہی فہما میں علم و فن کے آثار جو تخم کی طرح بکھرے ہوئے تھے نشوونما پانے لگ۔ اور تھوڑے عرصہ میں ان سلاطین کے دربار ارباب علم و فن اور خاص طور پر اردو شعر اکا قابلِ رشک مرکز بن گئے۔

اس عہد کے اردو کارناموں میں، امن و آسائش کی فکر اور فن کی اکثر خصوصیات موجود ہیں۔ اس طرح بیجا پور اور گولکنڈہ کے طول طویل ادبی کارنامے کوئی الفارقی چیز نہیں سمجھے جا سکتے۔ بلکہ یہ ایک پر امن ماحول کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اس ماحول نے قدیم شعرا کے وصولوں کو ہمیشہ بلند رکھا۔ چنانچہ اس عہد کے اکثر

شعر کے کارنامے مکمل اور مربوط تجویز دن اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں اشعار کے دیسیع سرمایہ پرستیل ہیں۔ ان کی تعداد بھی اتنی زیادہ ہے کہ اردو شاعری کے ارتقائے کسی اور عمدہ میں کم مل سکے گی۔

مثنوی اور غزل کا یہاں مقابلہ منظور نہیں۔ اسی طرح یہ سمجھنا بھی درست نہیں کہ غزل گوشترانے سالہ ما سال کی عرق ریزیوں کے بعد جو ضخیم دیوان جھوڑتے ہیں، وہ کسی مثنوی نگار کے کارنامے کے مقابلہ میں کم درجہ ہیں۔ بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ محض تغزل کو شاعری سمجھ لینا شعر کی وسعتوں کو نظر انداز کرنا اور دوسرا اصناف پر ظلم کرنا ہے۔

غزل ہو یا رباعی، اپنی بہترین صورت میں بھی منفرد اور منتشر خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ان اصناف میں جب طرح کے مفہای میں اور خیالات کے اظہار کی گنجائش ہے ان کے بظہر جانے کے بعد بھی ذوق شعری کی تکمیل کے لئے کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ ایک طویل، مربوط اور مکمل شعری کارنامہ کی نحليق مثنوی ہی کی شکل میں بہ وجہ احسن ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے کارنامے کی تکمیل میں زیادہ توجہ، محنت، فکر، ربط خیال اور احساس تناسب ز تیب اور تعمیر کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اس لئے جب ایک ہزار یا ڈیڑھ ہزار اشعار کی اچھی مثنوی تیار ہو جاتی ہے تو وہ ایک دس ہزار اچھے اشعار کے دیوان غزل کے مقابلہ میں بھی زیادہ مشہور اور

مقبول ہو جاتی ہے۔

یہ محض خیال نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ میر اثر کی شنوی "خواب و خیال" چند سو شعر کا ایک متوسط درجہ کا کارنامہ ہے۔ لیکن اس کو علمی دنیا میں بہت سارے اسائزہ کے دیوانوں سے زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ حالانکہ "خواب و خیال" تکمیل کے اعتبار سے ایک ناقص کارنامہ ہے۔ اس کا آغاز ایک قصے کے بیانیہ سے ہوتا ہے۔ مفہما سراپا پڑھتا ہے اور متھوفانہ افکار میں بیانیہ کا سر رشته گم ہو کر، ساری شنوی میں ایک ابہام پیدا کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک صوفی مشیش بیانیہ کی اس ظاہری بے ربطی میں کوئی معنوی ربط تلاش کر سکے۔ لیکن ایک عام دلخیسی کی خاطر مطالعہ کرنے والے کی تشفی نہ تو "اس شنوی" سے ہو سکے گی اور نہ کسی متھوفانہ توجیہ سے۔ اس کے باوجود یہ ایک واقعہ ہے کہ "خواب و خیال" بعض اچھے دیوانوں سے بھی زیادہ عرصہ تک زندہ رہے گی۔

"خواب و خیال" کے علاوہ، چند شنویاں اور بھی گنائی جا سکتی ہیں، جو اسلوب کی خوبی اور تخيیل کی بلندی کے نقطہ نظر سے دوسرے درجے کے غزل گوشہ رکھنے کے کلام کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتیں لیکن ان کو اردو شاعری کی صفت اول میں جگہ مل گئی ہے۔ مثال کے طور پر سودا کی اکثر شنویوں کو، میر کی چند اور مرزا شوق کی ایک آدھ شنوی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ میرزا علی لطف کی "نیرنگ عشق" کا بھی یہی حال ہے۔

یہ بات مخفی نہیں کہ غزل اور شنوی، دو بالکل جدا گانہ اصناف، بلکہ تالید متضاد اصناف ہیں۔ غزل مفرد اور منتشر خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے اور شنوی میں ربط خیال سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ غزل میں بعض تجھیل سے بھی کام حل سکتا ہے لیکن شنوی نگار بغیر حقائق کے قدم آگے نہیں بڑھا سکتا۔ غزل میں تکرار اور تقلید کی کافی کنجائش ہے لیکن شنوی میں تکرار ناممکن ہے اور تقلید محدود۔ اس لئے وہ اردو شنویاں بھی جو سنسکرت یا فارسی کا ترجمہ یا اخلاصہ ہیں یا ان کی تقلید میں لکھی گئی ہیں اردو جامہ پہننے کے بعد، ایک نئی چیز بن گئی ہیں۔ ایک بلند پایہ غزل گو شاعر کا کلام، عوام کے لئے دلچسپی کا مواد کم رکھتا ہے۔ لیکن ایک بلند پایہ شنوی سے بھی عوام کی تلقین اور تعلیم کا کام زیادہ آسانی سے لیا جا سکتا ہے۔ اس ایک خصوصیت کی وجہ سے مولانا حالی نے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر بھی نوقیت دی تھی۔

یہ ایک واضح بات ہے کہ غزل اور شنوی کے آرٹ میں بہت بڑا فرق ہے۔ غزل کا آرٹ غنائی اور ایمانی ہوتا ہے اور شنوی کا بیانی اور توضیحی۔ شنوی کی سب سے اہم خصوصیت جیسا کہ ظاہر ہے داقعات نگاری ہے۔ خواہ وہ فوق نظری ہوں، درا فطری ہوں یا فطرت نما اور خواہ وہ ززمیہ ہوں، بزمیہ ہوں کہ اخلاقی اور فلسفیانہ۔ اردو میں عشقیہ قصے اور محنت کی داستانیں شنوی کا عام اور مقبول موضوع رہی ہیں۔ تاہم اس بناء پر شنوی

کی اہمیت گھٹ نہیں جاتی۔ عشق اور مہمات کے قصے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا ایک معین مقصد ہوتا ہے۔ اور اگر بظاہر کوئی معین مقصد نہ بھی حاصل ہو، مستر زانی اور حرمت و تعجب کو اکسانے کے کام سے کسی طرح فاصلہ نہیں رہ سکتے اور یہ ادب کے مقاصد کے منحلہ ایک اہم مقصد ہے۔

شنسوی کے اسلوب اور طرز بیان میں شعری نزاکتوں اور ادبی لطافتوں کو استعمال کرنے کی بڑی گنجائش ہے۔ لیکن اس کا کمال، تسلسل اور ربط ہے شاعر کی توجہ، واقعات کے ارتقاء، ترتیب اور ربط میں زیادہ مهرد ہے۔ اس لئے بہترین شنسوی نگار بھی، خاص خاص مواقع کے سوا، صنایعی پر کم وقت صرف کر سکتے ہیں۔

شنسوی کا ایک تیساروصفت بیان اور اس کی توضیح اور تشریح ہے۔ اس مقام اور زمان کے علاوہ مواقع، مناظر اور نفسی کیفیات کی توضیحات بھی داخل ہیں۔ شاعر کی قوت تخلیہ ذرا بھی بیدار ہو، تو وہ اس ضمن میں، خاص لطف اور نزاکت پیدا کر سکتا ہے۔ بیانیہ، توضیحی اور نفسیاتی شاعری کے علاوہ غنائی اور طربیہ شاعری کے دلکش نہونے کبھی وہ پیش کر سکتا ہے۔ شنسوی کی رفتار کے دوران میں بیسوں ڈرامائی مواقع پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر شاعر انھیں ذرا توجہ سے سرانجام کر سکے، اور مرکالموں میں روزمرہ اور محاوروں کے ساتھ گفتار کے حسن ادا متكلم کی جذیبت کی رعایت

لحوظہ رکھے تو متنوی میں ڈراما کا لطف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک طویل کارنامہ ہونے کے اعتبار سے متنوی میں شاعر کا تناظر اور احساس تناسب بھی معرض امتحان میں آ جاتا ہے۔

سب سے آخری چیزِ متنوی کا وہ مقصد ہے جس پر اس صفت کی ساری عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ بعض وقت متنوی کا پایہ، اس کے مقصد کے اعتبار سے گھٹ یا بڑھ جاتا ہے۔ بہت کم متنویاں ایسی لکھی گئی ہوں گی جن کا کوئی معین مقصد نہ ہو۔ یہ مقصد مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، فلسفیاً ہو سکتے ہیں یا شخص فن کا ری اس کا مقصد ہو سکتا ہے۔

اگر طویل متنوی سر انجام کرنے میں، وقت کی تنگی حارج ہو تو چھوٹے چھوٹے مرقعے یا توضیحی (ڈسکرپٹو) متنویاں بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ جو ادب میں اپنا خاص مقام رکھتی ہیں۔

انھیں اباب کی بنار پر متنوی کو اگر فن کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک نہایت بسیط، مرکب اور کسی قدر پیچیدہ فن ہے جس کے تمام زاویوں پر روشنی ڈالنے کے باوجود لطف اور خوبی کا ایک بڑا حصہ تجزیہ اور تشریح سے مادرارہ جاتا ہے اور صرف ذوق اس کو پاسکلتے ہے۔ یہ فن کار کا ذاتی غرض ہوتا ہے اور یہی آرٹ ہے۔ اسی لئے ایک ترقی یا فتحہ مددان اور معاشرہ کے لازمی ذہنی اور ذوقی لوازم کے طور پر، مربوطِ خیالی واقعات کے ارتقا،

دینے اور ایک معین مقصد پر ان کو اختتام تک پہنچانے کی جب تک قدر و منزلت ہے گی، مثنوی کی طرز شاعری کی اہمیت گھٹ نہیں سکتی۔ یہ اور بات ہے کہ کسی زمانے کے شاعر، اپنے تمدن اور معاشرہ کی پیچیدگیوں میں الجھ کر گھفر ادبی اصناف کی طرف زیادہ مائل ہو جائیں یا لیکن جب کبھی ایک طویل اور بلند پایہ کارنامہ مثنوی کی صفت میں وجود میں آجائے، تو اس کے پڑھنے کے لئے مھروف سے مھروف زندگی میں بھی چند ساعتوں کی گنجائش ہمیشہ نکلتی رہے گی۔

اردو شنوی کے اولین نمونے

دنیا کی اکثر زبانوں میں شاعری کا ابتدائی محک اظہار، واقعات و مہات رہا ہے۔ اور یہ واقعات اور مہات زیادہ ترقومی روایتوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ قومی سورماؤں کے کارنامے اکثر زبانوں میں شاعروں کے اولین موضوع رہے ہیں۔ ان کے پیش کرنے کا انداز سادھا سیدھا اور راست ہوتا ہے۔ اس مرحلہ پر شعر ہمیشہ ابیات کی شکل اختیار کرتے ہیں اور یہی چیز فطری بھی ہے کیوں کہ زبان اپنے ابتدائی نشوونما میں قافیوں کی زیادہ پیچیدہ ترتیب، شرح و بسط اور بلند آہنگیوں کی کم تھمل ہو سکتی ہے۔ فارسی میں شنوی کی ابتداء اور اس کا ارتقادر اسی فطری اقتضا کے بموجب ہوا۔ چنانچہ فارسی کے اولین کارنامے، ایرانی قوم کی روایتوں اور سورماؤں کی داستانوں پر مشتمل ہیں۔ اسی جذبہ نے نشور نہ پا کر "شاہ نامہ" جیسی ضخیم اور بسط شنوی کی

شکل اختیار کی -

لیکن جس زمانے میں اردو شاعری کا آغاز ہوا، اس زبان کے بولنے والوں کے پیش نظر ایسا کوئی تصور نہ تھا بلکہ ان کے سامنے اور مسائل تھے۔ ابتدائی اردو بولنے والوں کو ایک نئی تہذیب اور نئی قوم کے ساتھ تعلقات بڑھانے تھے۔ ان کو سمجھنا اور اپنے آپ کو سمجھانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنے اور دوسروں کے لئے مذہبی عقائد کو واضح طور پر قلم بند کرنا تھا۔ اسی لئے ابتدائی اردو کارنامے زیادہ تر مذہبی نوعیت رکھتے ہیں اور ابتدائی اہل قلم عموماً مذہبی علماء اور صوفی ہوئے ہیں۔ فارسی بولنے والے جو ہندوستان میں بس گئے تھے، ہندوستانی زبانیں بولنے والوں کے ساتھ رہنے پر مجبور تھے۔ وہ فارسی سے نا بلد ہوتے جا رہے تھے۔ اس طرح اس نئی ہندوستانی زبان میں مذہبی عقائد کے نتقال کرنے کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی، اس لئے فطرتاً مذہبی مسائل اردو کے اولین ارباب قلم کے موضوع بن گئے۔

اردو کے ابتدائی ریخنوں کے بعد سب سے پہلے جو نظمیں ہمارے سامنے آئی ہیں وہ مختصر مثنویاں ہیں جو کم دبیش نویں صدی ہجری سے لے کر گیارہویں صدی کے اوائل تک لکھی گئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نظم پارے اپنی بنیادی بولیوں سے زیادہ مشابہ ہیں۔ تاہم ان میں فارسی اور عربی کے الفاظ اور

ترکیبیوں کی آمینرش سے ان میں ایک نئی زبان کے آغاز کے آثار موجود ہیں۔ یہ آمینرش رفتہ رفتہ زیادہ ہوتی اور صحت بخش حد تک ترقی کرتی گئی۔ اسی طرح اوزان میں بھی پہلے پہل پنگل اور ڈنگل کی تقلید کی جاتی رہی لیکن بعد میں فارسی بحروں نے ان کی جگہ لے لی۔ ابتدائی دور کی جپھوٹ جپھوٹ نظیں علمائے دین اور صوفیاً کرام کے ارشادات اور ملفوظات پر مشتمل ہیں، اور منوری کی شکل میں ہیں۔

منوری کا استعمال اردو میں عام طور پر داستانوں کے ساتھ مخصوص سا ہو گیا ہے۔ اسی لئے منوری کے نام کے ساتھ ہی "قطب مشری"، "پھول بن" یا "سحر البيان" کی طرز کے ادبی کارنامے کا تصور ذہن میں آ جاتا ہے لیکن قدیم اردو میں اس کا استعمال زیادہ لچک دار تھا۔ چنانچہ پیلیوں، نصالج، ملفوظات اور مستصوفانہ خیالات کے لئے منوری کی صفت ہی کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس طرح کی جپھوٹ جپھوٹی منوریاں اردو کے تشکیلی دور میں بہت لکھی گئیں۔ غزل جس کو محمد قلی (۹۸۸ - ۱۰۲۰ھ) کے زمانے سے اردو شاعری میں مقبولیت حاصل ہونے لگی اور جس کو ولی اوزنگ آبادی کے اثر نے نہایت اہم صفت بنادیا، اس زمانہ میں بہت کم لکھی جاتی رہی۔

ان اولین پاروں میں ادبیت کا اتنا لحاظ نہیں ہے، جتنا کہ مقصد اور انتہار مانی الفہمیر کا۔

قدیم ترین زمانہ کی اردو شنونی کے جو نونے دستیاب ہوئے ہیں وہ حضرت بابا شیخ فرید سکر گنج (متوفی ۷۶۷ھ) سے منسوب ہیں۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی اور مولوی عبد الحق صاحب کو قدیم بیاضوں میں آپ کے کلام کے نمونے دستیاب ہوئے ہیں اور ”پنجاب میں اردو“ اور ”اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاً کرام کا کام“ میں یہ نقل کئے گئے ہیں۔ پروفیسر شیرانی نے ایک ریختہ غزل نقل کی ہے اور مولوی عبد الحق صاحب کے اقتباس میں نظیم بھی ہیں۔ نظموں میں ایک ”بند“ کی شکل ہے اور دوسری مختصر شنونی جو ذیل میں درج کی جاتی ہے:

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک
پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک
ریش بلت سے گر ٹرے ہوتے
بوکڑوں سے نکوئی ٹرے ہوتے
خاک لالج نے سے گر خدا پائیں
گائیں بیلان بھی واصلان ہو جائیں
گوش چویاں (مکذا) کوئی نواصل تھا

عشق کا روز نیارا ہے جز مد پیر کے نہ چارا ہے
اس نظم کے زمانے اور اس کی زبان کی صفائی کا خیال کرتے ہوئے ثابت ہوتا ہے کہ شاید یہ بعد کی لکھی ہوئی ہو اور تبرگا کا تب نے حضرت شیخ فرید سے منسوب کر دی ہو۔ اس میں ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اکثر قدیم ترین اردو نظموں کے برخلاف اس کی بحتر فارسی ہے۔ فارسی بحریں اردو کے لئے

عام طور پر دکن میں اردو شاعری کے کسی قدر ترقی پانے کے بعد سے استعمال ہونے لگیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رجھتہ گولینی فارسی مصروعوں کے ساتھ ہندی مصروع جوڑنے والے شاعروں مثلًا امیر خسرد وغیرہ نے فارسی بھر میں بھی استعمال کی ہیں اور کہیں کہیں کوئی اردو غزل بھی فارسی بھر میں لکھ دی گئی ہے۔ لیکن تنہی، قطعہ اور بندوں کی شکل میں نظم عموماً ہندی بھروں میں کمی جاتی ہے۔

حضرت امیر خسرد (۶۳۲ھ - ۱۲۰) سے جو پیلیاں، ان میں اور کہہ مکر نیاں وغیرہ منسوب ہیں وہ بھی تنہی کے قافیہ کی ترتیب رکھتی ہیں۔ حالانکہ ایسی مختصر اور چار مصروعوں کی نظم اگر فارسی میں لکھی جاتی تو اس کے لئے رباعی یا قطعہ کے قافیہ کی ترتیب اختیار کی جاتی۔ ذیل کی نظم جو کسی قدر طویل ہے اور تنہی کی شکل میں ہے "پنجاب میں اردو" سے نقل کی جاتی ہے۔

وہ گئے بالم وہ گئے ندیو کنار	آپے پارا تر گئے ہم تو رہے اردار
بھائی رے ملا حو ہم کو پار اتا ر	ہاتھ کا دیوں گی مندا، گل گا دیوں گی ہار
دیکھ میں اپنے حال کو روؤں زار وزار	بی کن و تناہت ہیں ہم ہیں او گنہار
بابل ہبھی میں دنخ کوں تاندا کو پھول	ہو چھا دنخہ دہا جیا نالا ہا مول
چکرا چکری دو جنے انکوں رو نہ کو	اوہ مارے کرتا رکے رین بھوڑی بو

تیج دھیتی دیکھ کے روؤں دن رین
سبہ نادیں سو سکھ سیویں کنتا کوں گل لار
نازی جھوٹا دلیں میں قھبے پڑی پکار
گورے سرے پنگ پر مکھ پر دارے کیں
چل خسر و گھر آپنے سانجھ پڑی چو دلیں
بابا کبیر داس یا شاہ کبیر اس زمانے کے سب سے مشہور بزرگ ہیں، جن
کے متصوفانہ معتقدات نے انھیں ہندوؤں اور مسلمانوں سب میں مقبول اور
ہر دل عزیزہ بنا دیا تھا۔ ان کے دو ہے عوام کے زبان زد ہیں۔ لیکن ان
پر فارسی شاعری کا کبھی اچھا خاصا اثر تھا۔ چنانچہ پروفسر شیرانی نے ان کی
غزلیں کبھی ”پنجاب میں اردو“ میں نقل کی ہیں، گویا مشتبہ ہیں۔ بابا کبیر داس
کی ایک نظم ذیل میں منقول ہے جو شنوئی کے قافیہ میں لکھی گئی ہے۔

گئی بیس اب آیو بذرھا پا
سبھی بسیل میں کھیل گنوائی
ساٹھ برس میں جات نہ جانی
چھن جھپن دیہم کھبی ات جھینیاں
سب جو بن اکارت کھو یو
چیلا سید مراد سیانا
مور سکھی موہ یہ آس
کہ دیو مونکوں بارہ ماسہ

مانس مانس میں جی دکھ پائے تے جگ کوں ان آئے نایے

بر بھی سمت ہے بھیو گیا و سے اور تیس

بارہ ما سہ میں کھوں پنڈت دیو میں

نویں صدی ہجری کے او اخرا در دسویں صدی کے اوائل کے زمانے کے شاعر قطب بن نے ایک منظوم قصہ لکھا تھا جو "مر گا دتی" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ملک محمد جا سُسی کی طرز کا قصہ ہے اور ہندوستانی ادبیات کے ابتدائی کارناموں میں اس طرح کی نظموں کے کمیاب ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ پروفیسر شیرانی نے اپنی کتاب میں جو نمونے اس نظم کے نقل کئے ہیں ان سے ذیل کا اقتباس ماخوذ ہے:

شاہ حسین آہے بڑا راجا چھتر سنگا سن ان کو جھا جا

پنڈت اد بدھ دنت سیانا ڈھنے پران ارکھ سب جانا

دھرم رو دشل ان کو جھا جا ہم سر جھاہ جیو جگ راجا

دان دئے او، گفت ن آدے بلی او کرن نہ سر بر پا دے

راے چماں لوں گندے رہ ہیں سیوا کر ہیں یا سب چھ ہیں

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی (۸۶۰ھ تا ۹۲۵ھ) کے ملفوظات

میں بھی مختصر پارے مٹزوی کی شکل کے ملتے ہیں۔ آپ کی زبان اوزھریں

ہندی ہیں۔ لیکن فارسی اور عربی کے الفاظ بھی زبان میں موجود ہیں۔ ان

نظموں کے موضوع زیادہ تر متصوفانہ خیالات ہیں۔ آپ اکھ داس تخلص کرتے تھے۔ پروفیسر عافظ محمد شیرانی نے ”پنجاب میں اردو“ میں آپ کے حالات اور کلام کے نمونے دیے ہیں۔ کلام کا کچھ حصہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

بن پی کھیلے نہ کھیلا ہوئی	جان اجات سب کھیلنے لوئی
ہو ہو ہو ہو، ہولی رے	جان اجات جگ کھیلے رہے
سرب ترنتر پی پر وان	سبھ کھیلنے سکھی مہ جان
کنت بلیاں لیوں ہردے لاک لگ	جان اجات جگ کھیلے بھاک
ہم تم کھیلنہ دی گل بانہاں	اکھ داس آکھ سن تانہاں

حضرت شیخ بہاء الدین برناوی، دوسرے بزرگ ہیں جن کی نظمیں دستیاب ہوتی ہیں۔ یہ بھی تصوف اور معرفت کے موضوع پر ہیں۔ پروفیسر حافظ محمد شیرانی اور مولوی عبدالحق دونوں نے ان کے کلام کے نمونے نقل کئے ہیں۔ لیکن ان میں مثنوی کی طرز کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس زمانے کے اور بزرگوں کی طرح آپ نے بھی ہندی بھرا اور زبان میں جیسا کہ اس زمانے کے دوسرے صوفیائے کرام کا دستور تھا، مثنوی کے قافیہ کی ترتیب میں کچھ نظمیں لکھی ہوں، لیکن فی الوقت ان کے نمونے ہماری

دسترس میں نہیں ہیں۔

ایک اور بزرگ سید شاہ ہاشم حسین علوی، میں جن کا سنہ وفات ۱۰۵۹ء ہے۔ آپ گجرات کے مشہور صوفی حضرت شاہ وجہہ الدین گجراتی کے بھتیجے اور شاہ صاحب موصوف کے فرزند میاں شاہ عبداللہ کے مرید تھے۔ شزوی کی صفت میں آپ کا کلام کافی موجود ہے۔ اور یہ سب سلک و معرفت پر ہے۔ اگلی نظموں کے مقابلہ میں آپ کی نظمیں طویل تر ہیں۔ مولوی عبد الحق صاحب نے پنے مضمون میں ایک نظم دی ہے جس میں شاہ صاحب کے اپنے مرشد کے نیضان کا ذکر کیا ہے۔

شیخ عثمان جو محمد جمانگیر کے ایک شاعر تھے "چترادلی" نامی منظوم قصہ کے مصنف ہیں۔ اس کی زبان اور اوزان بھی ہندی ہیں۔ ذیل میں اس کا یک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

جن پچھوں دس کنہ پیانا	پھلیں گا سو دیں ملتا نا
دیکھے سی سنگھی لوگ سیا میں	مراون سب سلوہیں سائیں
ہیرے سے ٹھٹھے بگر سوہاوا	بہن ہرن سیویں گنجاؤا
کابل ہیرے موغل کر دیسا	جهاں پوہم پتی ہوئی زیسا
دیکھے سی ردم سکندر کیرا	سیام رہا ہوئی سکل انڈھیرا
دیکھے سی مکہ دوہی استھنا	ہئی اندھہ تیس پا ہن جانا

حاجی سنگ مل گیو مدینہ کا بہاگئے جو صاف نہ سینہ
 گا بغداد پیر کے تیرا جیھی نیج تیھی سنگ ہمہیرا
 استنبول، مصر پونہ ہمہیرا گا لداخ اموکنہوسی ہمہیرا
 دکھن دیں کو جے پکھ دھارا چلاتا کی سونگ پھارا
 مذکورہ بالانطیعن اس میں شک نہیں کہ قدیم اردو میں اور اکثر سندھی
 کی بحروف میں ہیں۔ ان میں عربی فارسی کے الفاظ بھی کہیں کہیں آتے ہیں
 تاہم یہ آیندہ اردو متنوی کا ہوا لامیں۔ اردو زبان کے ارتقاء میں یہ چیز
 خاص طور پر نمایاں ہے کہ جوں جوں اس کی اشاعت زیادہ ہوتی گئی، یہ فارسی
 سے زیادہ سے زیادہ متاثر ہوتی گئی۔ کیوں کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی
 ادبیات عالیہ کا ذریعہ یہی زبان تھی، اور عموماً ہندوستانی زبانوں کی شاعری
 اور انشا پردازی پر اس کا اثر پڑ رہا تھا۔ بعد کے زمانے میں گجرات اور خاص
 طور پر دکن میں اردو شاعری کو جو فاطر خواہ ترقی ہوتی اس کا طریقہ یہ تھا کہ
 یہاں کے شعراء نے اس کی ترقی میں فارسی سے استفادہ کیا جو شاعری میں
 بلند مقام رکھتی تھی۔ طویل نظموں کے لئے قافية کی ترتیب وہی قائم رہی لیکن
 بھروس زیادہ تر فارسی استعمال ہونے لگیں۔ اگر اردو زبان کو نشوونما کے اس
 ابتدائی مرحلہ پر فارسی کا سہارا نہ ملتا تو یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کو اس قدر
 جلد ترقی نصیب ہوتی۔ لیکن اردو شاعری کی تحریکات جب دہلی میں پہنچیں تو

فارسی کا اثر اس پر دکن سے بھی زیادہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ تلیٹی، استعارے اور شبہیں بھی فارسی میں استعمال ہونے لگیں۔ اور تھوڑے عرصہ کے اندر اندر یہ زبان اس قدر ترقی کر گئی کہ خود اس کا ایک ممیز ڈھانچہ تیار ہو گیا اور ایک ادبی روپ بن کھرا آیا۔

طوبیل تر متنویاں

اردو میں موجودہ متنوی کا حقیقی ڈول گجرات اور دکن میں ڈالا گیا اور دکن کے مراکنہ بجا پور اور گولکنڈہ کے شعراء نے فاص طور پر اس صفت کی شاعری کو ترقی دی۔ یہ بظاہر ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ اردو کی ابتدائی نشوونما، اس کے پیدائشی وطن کے بجائے دکن میں ہوئی۔ لیکن اس کے چند اباب ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بات ہے کہ ہندوستان میں عموماً عوام اور علماء کی زبان مختلف رہی ہے۔ علماء کا طبقہ، ہمیشہ اپنے پایے سے نیچے اتر کر عوام کی زبان اختیار کرتا رہا۔ پھر جب عوام کی زبان علماء کے طبقے کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تو عوام بول چال کی زبان سے مختلف ہوتی گئی اور عوام علوم و فنون سے ربط قائم کرنے کی کوشش میں اس سے نامانوس ہوتے گئے اور پھر دہ رفتہ رفتہ اپنی ضرورت کے مطابق زبان کو بنایتے یا بگھاڑ لیتے گئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اردو زبان کی تشکیل اور نشوونما کے زمانے میں

ہندوستان کے علماء اور اعلیٰ طبقوں اور حکومت کی زبان فارسی تھی۔ وہ اس کو چھپوڑ کر نیچے اترنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ لیکن جو لوگ، اہل فوج، علماء اور امرا، حکومت کے مرکز سے دور ہو گئے، مرکز میں تشکیل پاتی ہوئی زبان کو اپنے ساتھ لیتے گئے اور علماء اور صوفیا عوام کی تعلیم اور تربیت کے مذکور فارسی کی بجائے اسی زبان کو تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنانے پر مجبور ہو گئے۔ یہی سبب ہے کہ اردو کے اولین کارنامے دکن اور گجرات کی خود مختار حکومتوں کی سرپرستی میں زیادہ لکھے گئے۔ اردو کے علاقے سے دکن آنے والے ابتدائی دور کے علماء کا قیام فارسی بولنے والوں کا تعلق گجرات سے سلطان محمود غزنوی کے عہد سے قائم ہو چکا تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں گجرات دہلی کا صوبہ بن گیا۔ لیکن ظفرخاں، منظفر شاہ کی خود مختاری (۷۸۱ھ) سے گجرات میں ایک علیحدہ خود مختار سلطنت قائم ہو گئی۔ اس سلطنت کے قیام سے گجرات کے دارالحکومت احمد آباد کو اہمیت اور مرکزیت حاصل ہو گئی۔ اور اس کے حکمرانوں کی علم روستی کی وجہ سے اکناف ہند کے اکثر علماء، یہاں آ کر بس گئے۔

منظفر شاہ کے جانشینوں میں محمد شاہ اول اور بہادر شاہ علماء کے بڑے معتقد اور قدردان تھے۔ جو عالم اور صوفی یہاں آ کر آباد ہوئے ان میں سے اکثر عربی اور فارسی کے زبردست فاضل تھے۔ ان کے اطراف

عوام اور طالبان علم وہدایت کے جملگھٹے لگے رہتے تھے۔ انھیں کے رشد و ہدایت اور تعلیم و تربیت کی غاطران علماء کو اپنی زبان فارسی یا عربی کو ترک کر کے عوام کی زبان میں تصنیف و تالیف کرنا پڑتا تھا۔ ابتدا میں ان کے پسند و نصانع اور ملفوظات جو پرانی اردو میں ہوتے تھے انھیں معتقدین محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ ان ملفوظات میں سے جس قدر اب باقی رہ گئے ہیں وہ اردو کے محققین کے لئے بہت بڑی انسانی اور تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ ابتدائی دور کے لکھنے والے ہندوستان کی زبان یا زبانوں کو ہندی یا ہندوی کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ لیکن ہندوستان کی انسانی روایت کے مطابق مختلف علاقوں کی زبان علاقے کے نام سے موسوم ہو جاتی تھی۔ اس طرح اس زبان کے ابتدائی روپ کو گجرات میں گوجری اور دکن میں دکھنی یاد کرنی کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔

گجرات کے علماء میں بہت سے ایسے ہیں جن کے اردو ملفوظات دستیاب ہوتے ہیں لیکن یہاں صرف دو کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

ان میں سے ایک شاہ علی محمد جیو گام دھنی (دفاتر ۱۹۷۲ء) ہیں۔ یہ گجرات کے مشہور صوفی بزرگ تھے۔ آپ کے کلام کے مجموع کو آپ کے ایک مرید نے ”جو اہرام رار اللہ“ کے نام سے جمع کیا ہے۔ اس میں کئی نظمیں اور ابیات ہیں۔ ان کا پورا کلام متصرفانہ ہے ”اردو شہ پارے“

”پنجاب میں اردو“، اور ”اردو کی ابتدائی نشودنا میں صوفیاً کرام کا کام“ کے مولفین نے ان کے حالات اور کلام کے منونے دونوں یا مخفی حالات مفصل نقل کئے ہیں۔ نظم دو دو ابیات اور کبھی کبھی ایک ایک بیت کی شکل میں ہے اور اس میں مکاشفات اور معرفت کے رمز اور نکالت بیان کئے گئے ہیں۔ ذیل میں ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے :

کبھیں سویاڑے کبھیں رکاسا ہو کر چند اٹا رے با سا
دیہ الالا ہیچ بکھیرے روپ انپرے آپیں ہیرے

کبھیں سوہوئے انڈھیری راتا سانجھ بھی کر لادے دھاتا
ہو کر دیوار راتیں ساری لکر جوت دکھاوائے بھاری

مکھ پر بال بکھیر سو ساٹھی چھپ کر ہو دے رات سنگاتی
دلے سنبھال سو کھرے کیسا دن ہر آدمی سورج بھیسا
گھرات کے دوسرے قابل ذکر بزرگ میاں خوب محمد حشمتی (۵۹۷۶-۱۰۲۳ھ) ہیں۔ جن کی ایک مثنوی ”خوب تر زنگ“ کو اردوئے قدیم کے اہم کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ آپ احمد آباد کے رہنے والے تھے اور اپنے زمانے کے بڑے عارفوں میں شمار ہوتے تھے۔ قدیم اردو میں

ان کے کئی منظوم رسالے موجود ہیں۔ جن میں سے ایک "بھاؤ بھید" صنائع بدائع پر ہے۔ لیکن ان کی مثنوی خوب تر نگ، کو جو شہرت حاصل ہوئی درستے کارناموں کو حاصل نہ ہو سکی۔

"خوب تر نگ" ایک کافی طویل اور مکمل مثنوی ہے۔ اس کا نام تصنیف ۹۸۶ھ ہے۔ یہ "مثنوی معنوی" کی طرز کی اخلاقی اور تھوفت کے نکات پر مشتمل نظم ہے۔ زبان بہت قدیم ہے اور گجراتی سے متاثر ہے۔ "مثنوی معنوی" کی طرح اس میں بھی چھوٹے چھوٹے قصوں کے ذریعہ مطالب کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان قصوں میں سے بعض خاصے دلچسپ ہیں۔ مثلاً چین کے مصور بکا قصہ یا اپنی خودی کو فنا کرنے کی مثال کے طور پر جو قصہ بیان کیا ہے، مختصر منظوم قصوں کے اچھے نمونے ہیں۔ "خوب تر نگ" کی ادق زبان کی وجہ سے خود مصنف نے اس کی شرح فارسی میں لکھی تھی جو "امواج خوبی" کے نام سے موسم ہے۔

"خوب تر نگ" کی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ ذیل میں مطبع نعانی کے چھپے ہوئے لسمہ سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں صفائی قلب کی تکشیل کے طور پر ایک قصہ بیان کیا گیا ہے کہ چین میں ایک گردہ نقاشوں کا ایسا باکمال تھا کہ اڑتے ہوئے مور کا نقش بھی کھینچ لیتا تھا۔ وہاںاتفاق

سے ایک اور گردہ مصوروں کا پہنچ گیا اور اس نے اپنے کمال کا دعویٰ کیا۔ آخر طے ہوا کہ بادشاہ کے پاس جا کر اس کا تصفیہ کراہیں۔ بادشاہ نے انھیں حکم دیا کہ دو دیواروں پر نقش کھینچ کر دونوں گروہ اپنا اپنا کمال کھائیں۔ انھیں ایک وسیع ہال میں رکھا گیا اور دونوں کے کام کو ایک درسرے پر ظاہر ہونے سے بچانے کے لئے درمیان میں ایک پرده باندھ دیا گیا۔

چین کے نقاشوں نے جب نقش بنانے شروع کئے تو حصے رنگ انھیں مل کے ان سب کو استعمال کر کے ایسی تصویر بنائی کہ کسی کے وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ بھول پتے ایسے اصلی معلوم ہوتے تھے کہ پرندے آکر ان پر بیٹھنا چاہتے تھے۔ پرنسپیلوں نے جب دیکھا کہ ان کے لئے کوئی رنگ ایسا باقی نہیں رہ گیا ہے جسے چین کے نقاشوں نے استعمال نہ کر لیا ہوا تو انھوں نے اپنی ساری توجہ دیوار کو صاف کرنے پر صرف کر دی اور ایسی مجلہ کر دی کہ ابینہ بن گئی۔ امتحان کے روز جب بادشاہ اس مقام پر آیا تو پہلے اپنے دھن کے نقاشوں کے پاس گیا اور جب ان کے کمال کو دیکھا تو ٹڑا پسند آیا اور ٹڑی تعریف کی۔ پھر پرنسپی مصوروں کو پرده ہٹانے کا حکم دیا۔ جب پرده ہٹایا گیا تو بادشاہ کی حیرانی کی کوئی انتہا نہیں رہی کیونکہ جو تصویر یہاں تکھی بعینہ دہی تصویر وہاں بھی تھی۔ ذیل میں ”خوب تر نگ“ کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

حکایت صفائی دل

چین مہین چتاری جان
 تنه کیتک چتاروں اور
 دراں دعوی کیا سو آنس سٹھور
 کھیا باشاہ کن چل جائیں
 گئے سلطان کپس سب چل
 دونہ ٹولوں چل کیا سلام
 حکم بادشاہ کا جو پائیں
 ہوا پادشاہ کا فرمان
 کھیا کے جا کر کرو اتاں
 دونہ ٹولے چرسی دونہ ٹھانہ
 جب لگ کام ادھورا ہوئے
 سہدیسے چتاروں آئے
 رنگ آمیز کیا اس بھی کے
 لگن پھرے دھری من کھانت
 سبھی زماناں سیکھیا رنگ
 ایسے بھانتی رنگ ملائے

چتری مور سو اڑتے آن
 دعوی کیا سو آنس سٹھور
 کھیا باشاہ کن چل جائیں
 آسلطانیں دیا محش
 ہوریہ کیتا عرض تمام
 چتر سال کچھ کہ دکھائیں
 دیتا دونہ ٹولوں کو مان
 انہیں سانہمیں دو دوال
 دونہ یردے باندھیں نجع مانہ
 تب لگ ان کن جائے نہ کوئے
 چین مہین پوں زنگ ملائے
 زنگ پھرا کئی سیپ سو دیکھ
 ہر رنگے سکھے اور بھانٹ
 نوے نوے دکھلا دے ڈھنگ
 پری زنگوں میں چتر دکھائے

چتر میں بیج جھکتے چین ہوئے اجالا جس تے عین
 صورت اس اس بحانت لکھائیں جہاں وہم کے پاؤں بندیں
 تنہ پر دیسی تھے آئے رنگ تہنوں کوں کچھ نہ پائے
 ان ساروں مل کیا بکار کھوانہوں کیا کریں اس فار
 یہ ساروں مل پر تھے بات کھوٹ جھلکتی کریں دوال
 جیوں آرسی سنہ ہوئے اجال مل دیا سلطان نے تب
 دن وعدے کا تھا جب دوسری اگ پر دے کھانا
 سب چیرت میں ہوئے سود کچھ دونہ پاسوں چڑیا ک بھی کیوں
 حضرت گیسر دراز جن سے "معراج العاشقین" اور "شکار نامہ" کے علاوہ
 کئی اور نشری رسائے مسوب ہیں کچھ نظموں کے مصنف کبھی بتائے گئے ہیں لیکن
 متعین بات نہیں ہے۔

گجرات کی خود مختاری کے زمانے ہی میں، دکن کی بھمنی سلطنت کے
 انفراض سے پائیج خود مختار سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں۔ ان میں بجا پور اور
 گولکنڈہ کی سلطنتیں اردو زبان اور ادب کی سر پرستی کے باعث لازوال شہرت
 حاصل کر چکی ہیں۔ ان سلطنتوں کے حکمران علم و فضل اور شعروادب کے بڑے
 قدردان تھے چنانچہ گجرات کے عروج کے زمانے ہی سے وہاں کے علماء اور

فضل اسر پرستی کا شہرہ سن کر بیجا پور آنے لگے تھے۔ لیکن ۱۵۰۲ء میں جب اکبر نے گجرات کو فتح کر کے دہلی کے ساتھ شامل کر لیا تو ہجرت کرنے والے علماء کی تعداد زیادہ ہو گئی۔ ادھر بیجا پور کے سلاطین اپنی علم پروری کے سبب محسود زبان بن رہے تھے۔ نہ صرف گجرات بلکہ ہند، ایران اور عرب کے علماء بھی یہاں آ کر بسے گئے تھے اور یہاں اردو زبان سیکھ کر اس میں تصنیف و تالیف بھی کرنے لگے تھے۔ انھیں میں حضرت شاہ میران جی شمس العشاق (وفات ۶۹۰ھ) بھی ہیں جو اپنے تقدس اور علمی وقار کے سبب، بیجا پور میں رشد و ہدایت کا مرکز بن گئے تھے۔

شاہ میران جی کی ولادت مکہ میں ہوئی۔ لیکن آپ ہندوستان تشریف لانے کے بعد بیجا پور میں فروکش ہو گئے۔ آپ کو شاہ کمال الدین مجرد بیانی سے ارادت کھتی، جو حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز کے خلیفہ حضرت شاہ جمال الدین کے مرید تھے۔ بے شمار لوگ آپ کے معتقد تھے۔ انھیں کی روحانی تعلیم کے لئے آپ نے عربی زبان ترک کر کے، اردو میں کئی رسائل تصنیف فرمائے جن کا علمی اور ادبی پایہ بلند ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی "تصنیف" اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام،" میں آپ کے ویسے فیضان اور اردو زبان کی نشوونما پر آپ کے اثر کا تذکرہ کرتے ہوئے ٹھیک فرمایا ہے کہ "اسی مبارک خاندان کا اثر تھا کہ بیجا پور میں زبان کو اس قدر فروغ

ہوا۔ اور وہاں ایسے ایسے خوش بیان اور بلند خیال شاعر پیدا ہوئے جن کی نظریاردو کے شاعروں میں بہت کم ملتی ہے۔

آپ کا بیشتر کلام، منوی کے قافیہ کی ترتیب رکھتا ہے۔ کلام کے مجموعے کا ایک مخطوطہ مولوی عبدالحق صاحب کے کتب خانے میں موجود تھا۔ کچھ کلام کتب خانہ جامعہ غوثانیہ کے ایک مخطوطے میں بھی ملتا ہے۔ ذیل میں ایک منوی کے حمد کے حصے سے اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تُوبَسْجَان

يَسْبُ عَالَمَ تَسِيرَا رِزْقَ سَبُّهُونَ كَسِيرَا

بَخْجَهُ بَنَ اَوْرَنَهُ كَوَنَ نَافَالَقَ دَوْجَا هَوَنَ

جَسَّهُ تَسِيرَا هَوَے كَرَمَ نَدُوَنَهُ سَبُّهُي بَحْرَمَ

تَجَهُ زَتَالُو مَرْجَانَهُ اَوْرَبُورَى صَفَتَكَبْهَلَنَهُ

ہَے تَسِيرَا نَتَنَتَ نَپَارَ كَسَ مُوكَھُونَ كَرُونَ اَچَارَ

جَوْتَسِيرَا مَرْجَانَهُ اَسَنْهَى كَوَنَ نَمَانَهُ

آپ کی ایک مکمل منوی جو "خوش نامہ" کے نام سے موسوم ہے خاصی دلچسپ ہے۔ اس کا ایک اقتباس بھی یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

کبھی نہ رنگی مید ہی رنگوں پھولوں باس ن آیا

رنگ ن رنگیا دستو اس کے بھی نہ بلدوں کا یا

کئے منجھ سیرہماگ اللہ کا چھڑ رہا سہادا
 اب کیوں سرہاد سے دو جا کم کونا ہیں ٹھادا
 اسی کے زکوں زنگی ساری دو جانگنے بالی
 اس کی بسا ہم کو باسا پھول بھوکٹ کی آئی
 اسی باتیں کرے گنڈتی مور کھ بھیں صدھ
 یہی من آرے اپنے چھند سو ہی سکھا دیں بُدھ

"خوش نامہ" کے علاوہ آپ کا ایک اور منظوم رسالہ "خوش نفر" بھی ہے جس میں تصرف اور معرفت کے بحثات بیان کئے گئے ہیں۔ آپ کے کچھ رسائلے نثر میں بھی ہیں جن میں "شرح مرغوب القلوب" بہت مشہور ہے۔

حضرت شاہ میراں جی کے فرزند اور خلیفہ، شاہ برهان الدین جانم (وفات ۹۹۹ھ) بھی اردو میں کئی رسالوں کے مصنف ہیں۔ یہ رسائلے زیادہ تر منظوم اور متنریاں ہیں۔ طویل نظموں کے لئے آپ نے فارسی کی بحیریں بھی استعمال کی ہیں۔ اس طرز کی اولین اردو نظمیں سب سے پہلے آپ ہی کے کلام میں دستیاب ہوتی ہیں۔

ایک مخطوطہ جو نظم اوز شر کے چند رسالوں پر مشتمل ہے کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔ ذیل میں اسی نسخے سے متنی اول

کے حصہ حمد کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔
 الٰہی کلیاں کھول حاجات کیاں
 برآ دین مراد اس مناجات کیاں
 ترانا و کبیلی ہے ہر گنج کا
 ترا رحم مرہم ہر ایک رنج کا
 کیا کوچہ مرمت اس ٹھوار سوں
 کہ چن نے محمد کے گلزار کوں
 کیا آپ اول اپیں ابتداء
 رکھیا ناؤں اپس اود پر خدا
 نہ صورت کسی شے کی تھی درمیاں
 نہ تھاناؤں کے گاؤں کا کیس نشاں
 نہ تھانور، ظلمت نہ رخسار و خال
 نہ معشر ق عاشق عدیم المثال
 چھپی عشق بازی کیا آپ میں آپ
 جہاں خیر و شر کا نہ تھا پن (و) پاپ
 بجز چشم بینائی کا نور تھا
 بجز گوش شنوائی معور تھا

تکلم کیا تھا بغیر از زبان
کہ سمجھا تھا ہر شے بغیر از نشان

آپ کی دوسری نظموں میں "نیم الكلام من فع الام" ، "سکھہ سہیلا" ،
اور "ارشاد نامہ" وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ ان میں بعض نظموں کو ڈاکٹر سید محمد الدین
 قادری زور نے مجلس اشاعت دکونی مخطوطات کے لئے مرتب کیا تھا ۔ "ارشاد
نامہ" سے ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو حضرت شاہ
میراں جی کی مدح پر مشتمل ہے :

صفت کر دن کچھ اپنا پیر	جس تھے رہن ہوئے ضمیر
جن منجھے لیتا کر اپدیں	باریں اس چک لیوں گولیں
دھن جگ میں منجھہ میت وہی	سمروں لے من نیت وہی
تس کوں سمریں تن من شاد	جس کا آہے منجھہ پر ساد
جگ میں آہے توں ہیں رتن	ہر دے میں لے کر دن جتن
را کھیا کوندن کر اس طھادُں	تل تل سمرروں لے اس نانوں
پیر میراں جی شمسِ عشق	دھوں جگ رب تجھے کیا کشاف
آہے تیری یہ بنیاد	چشتیاں تیرا ہے خانوار
جس کو آہیں اندر چشت	آل کہیں ان کو اہل بہشت
پیر ہی منجھے ہے مرشد	نت بکھانے ان توحید

سن تین کھولیں دل کی بات روشن ہوئی حقیقت بات
 شریعت میں تورہ رہ راس راہ حقیقت اس کے پاس
 حضرت شاہ بہان الدین جانم کے فرزند اور خلیفہ حضرت شاہ امین الدین
 اعلیٰ بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ آپ نے بھی کئی تصنیفات چھوڑے۔
 آپ کا زمانہ عادل شاہی سلاطین کا آخری عہد ہے۔ اس لئے آپ کا
 تفصیلی ذکر، آپ کے معاصرین کے ساتھ کیا گیا ہے۔

قدیم مہنولوں کا عروج

بہ ظاہر ایک عجیب حسن اتفاق معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی سال یعنی ۹۸۸ء میں بیجا پورا اور گولکنڈہ میں دو ایسے سلاطین تخت نشین ہوئے جن میں سے ہر ایک علم و فضل اور شعر و ادب کی قدر دانی میں دوسرے پر بفت لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ سو سال کے عرصہ میں ان دونوں مرکزنوں میں علم و ادب کا ذوق اتنا ترقی کر گیا تھا اور اردو کے ایسے اچھے شاعر پیدا ہونے لگے کہ جن کی خوش بیانی کے مقابلہ میں فارسی شاعری کا مذاق بھی کاٹ پڑ گیا تھا۔ اسی فضاء کے آفیضدار کے دراصل بیجا پور میں ابہا ہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ - ۱۰۳۷ء) اور گولکنڈہ میں محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ - ۱۰۲۰ء) جیسے سرپرست ادب سلاطین پیدا کئے۔ یہ دونوں سلطنتیں ہمسایہ اور ہم عصر تھیں۔ اس لئے ان کے مذاق میں مناسبت موجود تھی۔ پھر معاصرانہ چشمکیں بھی ان سلاطین اور ان کے جانشینوں کو

خاص طور پر اردو شاعروں کی سرپرستی میں، ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رہے پر ابھارتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قدیم اردو ادب کی تاریخ میں یہ زمانہ شعروادب کے وسیع چرچوں اور کثیر پیداوار سے معmor ہے۔ اسی لئے اس کو عروج کے دور یا سنہری دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس زمانے کے اردو شعرا اور ادیبوں کے مذاق میں جونگھاڑ پیدا ہو گیا تھا اس کا بڑا ثبوت ان کے کارنامے ہیں۔ اس سازگار فضائی سینکڑوں خوش گفتار شعرا کی تربیت کی۔ ان میں انشا پر دانہ بھی تھے اور شاعر بھی۔ اکثر شاعر ایسے تھے، جنہوں نے ہزاروں اشعار کی طول طویل اور دلکش نظمیں سرانجام کیں۔ اردو میں جتنی مثنویاں دہلی اور لکھنؤ میں لکھی گئیں، ان سے کمی گئی زیادہ مثنویاں صرف اس سو سال کے عرصہ کے اندر اندر دکن میں تصنیف ہوئیں۔

یہ مثنویاں جن کا کسی قدر فصیلی ذکر آئنده ابواب میں کیا گیا ہے زیادہ تو قدیم فوق فطری طرز کی داتا نہیں ہیں۔ ان میں سے اکثر فارسی مثنویوں یا ہندوستانی نظموں کے ترجمے بھی ہیں۔ لیکن طبعزاد اور نئی مثنویاں بھی کچھ کم نہیں لکھی گئیں۔ فارسی ترجمے لفظی بہت کم ہیں اور آزاد ترجمے اور ماخوذ قصتے زیادہ ہیں۔ خاص طور پر رزمیہ مثنویاں تو اس عمد کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ بعد کے شعرا پر ایک تو تغزل کا زنگ زیادہ چھا گیا تھا، دوسرے

جنگ و جدل کے وہ نقشے بھی، ان کے سامنے نہیں تھے جن سے اس عہد کے اکثر شعراً کو سابقہ ٹپڑتا تھا۔

طول طویل ادبی کارناموں کے لئے اردو کی پوری تاریخ میں، یہ زمانہ خاص طور پر مساعد تھا۔ گذشتہ دو تین سو سال کی امن و امان کی زندگی، مردمی اور شعری مذاق کی ترقی کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔

بیجا پور میں ابراہیم عادل شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی ملک کی علمی فضای بدل گئی۔ اس کے گوناگون اسباب تھے۔ سب سے پہلا سبب اس کے اسلاف کے عہد کا امن و امان اور ملک کی خوش حালی تھی۔ دوسرا سبب اس نے فارسی شعرا کے مقابلے میں اردو شعرا کو اس لئے آگے بڑھایا کہ یہ عہد کے ادبی ذوق کا تقاضا تھا۔ فارسی شعرا کی سر پستی سے اس کو مغل شہنشاہوں کی سی شہرت کبھی نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ گذشتہ سو سال سے جو ادبی ذوق بیجا پور میں نشوونما پارہا تھا اس کو جملئے کے لئے صرف ذرا سی تحریک کافی تھی، چنانچہ ابراہیم نے اردو شعرا پر عنایت اور لطف کی نظر کی اور سینکڑوں سخن پر دازابھرے اور اطراف و اکناف بلکہ شمالی ہند سے بھی بیجا پور آگئے اور سخن سنجیوں کی خوب خوب دار دی جانے لگی۔

abraahim ka zauq hussn karai, koi muumoli druge ka nہیں تھا۔ ایک

صاحب ذوق، ادیب، شاعر اور ماہر موسیقی ہونے کے اعتبار سے اس کی شهرت ہمیشہ زندہ رہے گی۔ علماء شعراً اور اہل کمال کے ساتھ اس کا جو لگاؤ تھا اس کا ثبوت اس کے دربار میں قابلِ اعتنا ادیبوں، شاعروں اور عالموں کے جمع ہو جانے سے ملتا ہے۔ چنانچہ اس کے زمانے میں ارسلان نت میں ابوالقاسم نزرشہ اور رفیع الدین ابراہیم شیرازی جیسے مردخ، حکیم آتشی، مولانا حیدر ذہنی اور مرتضیٰ امیم جیسے علماء اور ملا ظہوری، باقر قمی۔ عبدالقادر نورسی جیسے شاعر اور ادیب موجود تھے۔ اردو سے اس کو اس قدر لمحپی سمجھی کہ اس نے اپنے بھائے ہوئے شہر، بنائے ہوئے محلات، باغوں اور راہوں کے اکثر نام اردو ہی رکھے تھے۔

ابراهیم کے جانشین محمد اور علی (۱۹۳۶ء تا ۱۹۷۶ء) اور (۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۳ء) کے زمانہ میں اردو شاعری کا ذوق گویا معراج کمال کو پہنچ چکا تھا۔ ابراهیم کے عہد میں جس ذوق کی نشوونما ہوئی تھی اس کے باار آور ہونے کا یہ زمانہ تھا۔ چنانچہ محمد کے عہد کے شعراً میں رسمی، صنعتی اور رولٹ اور علی کے زمانہ کے شاعروں میں مک الشعرا نصرتی، شاہ ملک، ہاشمی وغیرہ مشہور اور مسلم الشبوت اساتذہ فن ہوتے ہیں۔ اس خاندان کے آخری تاجدار سکندر عادل شاہ کا عہد اس ستمم باشان آغاز کا حُزْنیہ انجام ہے۔

بیجا پور کے ساتھ ساتھ گولکنڈہ کی ادبی ترقی کی ابتداء محمد قلی قطب شاہ کے عہد سے ہونے لگی تھی۔ محمد قلی جو ابراہیم کا معاصر تھا اور ابراہیم سے ۱۸۶۱ پہلے فوت ہوا، اس کو بھی ابراہیم کی طرح طویل امن و امان اور خوش حالی کا زمانہ نصیب ہوا۔ اور اردو شعرا کی سرپرستی میں یہ اور اس کے جانشین اپنے بیجا پوری معاصرین سے کبھی پہچھے نہیں رہے۔

ہم سائیگی اور مذاق کی یگانگت کی وجہ سے اکثر علماء اور شعرا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے۔ اسی باہمی ربط نے گولکنڈہ اور اور بیجا پور کی علمی اور ادبی فضار میں ہم آہنگی پیدا کر دی تھی۔ بیجا پور مغربی ساحل سے قریب تر ہونے اور ایرانی سلطنت سے عادل شاہیوں کے روابط کی وجہ سے پھر بھی یہاں فارسی کا کچھ نہ کچھ اثر تھا۔ لیکن گولکنڈہ میں یہ اثر بہت کم تھا۔ یہاں اردو ہی کی چیل بیل زیادہ تھی۔

اس زمانے میں عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین نے اردو شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی جو کوشش کی، اس کو دیکھ کر خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد اسلامی سلطنت کے مختلف حضروں کے حکمرانوں اور امیروں، بنو بویہ، بنو سامان، بنو صفار وغیرہ نے فارسی شعرا کی سرپرستی میں ایک دوسرے سے جو مسابقات کی اس کا نقشہ ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔

محمد قلی سے پہلے گولکنڈہ کے اردو شاعر میں صرف چند شاعروں کا پتہ
چل سکا ہے جن کے نام شیخ احمد ملا خیالی، فیروز اور سید محمد ہیں۔ ان کے
کسی کارنامہ کا حال اس وقت معلوم نہیں ہے۔ بعد کے شعرا جیسے ابن
نشاطی وغیرہ نے ان کا ذکر کیا ہے، جس احترام کے ساتھ وہ ان کا نام لیتے
ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اپنے زمانے کے اساتذہ سمجھے جاتے تھے۔
مثلاً ابن نشاطی نے ان کے متعلق جو شعر لکھے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

نہیں دو گیا کروں فیروز استاد کہ دیتا شاعری کا کچھ مراد داد
اہے صد حیف جو میں سید محمد کتے پانی کوں پانی دو کوں دور
نہیں اس وقت پر دشیخ احمد سخن کا دیکھتے باند دیا سو میں سد
حسن شوقی اگر ہوتا تو الحال ہزار لکھ بیتا رحمت منجھے اپہال
اچھے تو دیکھتا ملا خیالی یوں میں بر تیا ہو سکھ صاحب کمال
شیخ احمد غالباً وہی ہے، جس کی مشنوی "یہاں مجذوب" کا اقتباس شیرافی
نے "پنجاب میں اردو" میں دیا ہے۔

محمد قلی کا پایہ اردو شاعری میں بہت بلند ہے۔ وہ نہایت پڑھ گئے
شاعر تھا اور ایک ضخمیم اردو کلیات اس نے یادگار چھوڑا ہے۔ غزل جس کی
قبولیت ولی اور نگ آبادی کے زمانے سے بہت بڑھ گئی تھی اس کی
ابتدا محمد قلی سے ہوئی۔ اپنے زمانے کے دوسرے شعرا کے برخلاف اس نے

اپنا پورا کلام غزل میں یا غزل کی شکل میں لکھا۔ حتیٰ کہ اس میں وہ نظموں کے موضوعات جیسے سالگرد کی تقریبیں کا حال، حمد، منقبت وغیرہ سب کچھ لکھتا تھا۔ ابراہیم کی زبان پر کھڑی بولی کا اثر زیادہ تھا۔ لیکن محمد قلی کا کلام قدیم اردو میں ہے۔ غزل میں وہ اکثر حافظ شیرازی کی تقلید کرتا ہے۔ اس نو خیز زبان میں حافظ جیسے نغمہ گو شاعر کے تخیلات کو ادا کرنے آسان کام نہیں تھا۔ محمد قلی ایک حقیقی شاعر کی طرح ذوق نظر اور لطف گری یا فہرست کر رکھتا تھا۔ اس نے اس کے کلام کا ٹرا حصہ عاشقانہ اور غنائی ہے۔ اس کے ضمنیم کلیات کے مقدمہ میں حیات اور اس کے مختلف بہلوؤں پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس کی توضیحی نظیں میر کی مشتیوں کی طرح دلچسپ ہیں۔ کلیات کو ڈاکٹر سید محمد الدین قادری زور پر فیسر اردو جامعہ عثمانیہ نے مرتب کر کے ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات کی طرف سے شایع کیا ہے۔

محمد قلی کے دربار کی سر پرستیوں نے بعض ایسے شعرا کو منظر عام پر آنے میں مددی جن کا نام اردو شعرا میں احترام سے لیا جاتا ہے اور جن کے کارنامے لازوال ثہرت کے مالک ہیں۔ ان میں وجہی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

محمد قلی کا جانشین محمد قطب شاہ (۱۰۳۵ھ - ۱۰۴۰ھ) سلطنت اور ذوق دولوں اعتبار سے اس کا وارث تھا۔ نہ صرف شہر حیدر آباد کی خوبی کو

بڑھانے اور علماء کی قدر دانی میں وہ اپنے چھپا کے قدم بہ قدم تھا بلکہ اردو شاعری کا مذاق بھی اس کو درثہ میں ملا تھا۔ اس نے بھی ایک دیوان یادگار چھوڑا۔

محمد کے دربار کے شعرا، میں، محمد قلی کے عہد کے باقی ماندہ شاعروں کے علاوہ اور کئی اچھے اچھے سخن سنجوں کا اضافہ ہوا جن میں حسن شوقي فاص رتبہ رکھتا ہے جو پہلے نظام شاہ کی سرپرستی میں بصر کرتا تھا اور ایک رزمیہ "شنوی" "ظفر نامہ" کے نام سے اس نے لکھی تھی۔

محمد کے بعد عبد اللہ (۱۰۸۳-۱۰۳۵ھ) تخت نشین ہوا۔ اس کے عہدگریہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں قدیم اردو شاعری عروج کمال کر پہنچ گئی۔ جتنے بلند پایہ اساتذہ اس کے عہد میں موجود تھے، دکن کے کسی اور حکمران کے عہد میں نہیں مل سکیں گے۔ اس کو بھی شعروں سخن کا ذرق درثہ میں ملا تھا۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کھاتا تھا۔ ان زبانوں میں اس نے دیوان بھی چھوڑا، میں چنانچہ اس کا اردو دیوان مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات کی سرپرستی میں مولوی سید محمد صاحب کی ترتیب کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ قطب شاہی خاندان کے حکمرانوں میں جتنی طویل مدت حکمرانی اس کو نصیب ہرنی، کسی اور بادشاہ کو نصیب نہ ہو سکی۔ اس نے پورے پیاس سال حکومت کی۔ اس طویل عرصہ میں اسے بہت سے اچھے اچھے شاعروں کی

سر پرستی کرنے کا موقع ملا۔ غواصی اور ابن نشاطی اسی عہد میں عروج پر پہنچے۔ اس وقت اردو زبان اور شاعری اتنی ترقی کر چکی تھی کہ اس کے مقابلے میں محمد قلی کے عہد کی زبان بھی قدیم معلوم ہوتی ہے۔ گوکنڈہ کی پرخطمت شاعری کا دور گویا عبداللہ پر ختم ہو جاتا ہے۔

عبداللہ کے جانشین سلطان ابوالحسن تانا شاہ (۱۰۸۳-۱۰۹۸ھ) کا عہد نہ صرف کوکنڈہ کی سلطنت کا اختتام ہے بلکہ قدیم اردو شاعری کی ترقی بھی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابوالحسن کا ذوق بلند پایہ تھا اور اس کی طبیعت حد درجہ نفاست پسند واقع ہوئی تھی۔ تاہم اس کے زمانے میں شعر سخن کے وہ چرچے نہیں رہے جو اس سے پہلے تھے۔ روحات اور تصوف سے اسے خاص لگاؤ کتھا۔ اس کے دربار کی علمی چمل پیل کا پورا نقشہ ہماری دسترس میں نہیں ہے۔ حالاں کہ پایہ تخت میں اب بھی اچھے نفر گو شاعر دیکھی نہیں تھی۔ ان میں فائز، رطیف، غلام علی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان کے کارناموں سے ماحول کی بے اطمینانی اور ہمتوں کی پستی کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ ابوالحسن نے ۱۵ سال حکومت کی اور آخر کار اور نگ زیب کی قید میں زندگی کے آخری سال گذار کر دنیا سے رخصت ہوا۔ گوکنڈہ کی سلطنت کے خاتمه سے دکن کی علمی اور ادبی مرکزیت رفتہ رفتہ ختم ہو گئی اور دکن مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔

اس عہد کی پیداوار اس قدر کثیر ہے کہ سہولت کی خاطر اس کو دو حصوں
پر تقسیم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے بیجا پور اور گوکنڈہ کی مبنیوں
کا ذکر علمیہ علیحدہ ابواب میں کیا گیا ہے۔ گوان دونوں مرکزوں میں شعروادب
کا عروج ساتھ ساتھ ہوا۔ بیجا پور کے کارناموں کا ذکر اس لئے پہلے کیا گیا ہے
کہ یہ سلطنت، گوکنڈہ کی سلطنت سے گیارہ سال پہلے قائم ہوئی تھی اور اس کا
تعلق قدیم مرکزوں گجرات اور احمد آباد سے بھی رہا تھا۔ نیز اردو شاعری کا چرچا
پہلے یہیں کھیلیا۔ گوکنڈہ کا تعلق بعد کے دور سے بھی ہے۔ چنانچہ بیجا پور
کے اکثر شاعر عادل شاہی حکومت کے خاتمے کے بعد گوکنڈہ چلے گئے تھے۔
گوکنڈہ کی تباہی کے بعد شعرا، اور علماء و میور، آرکٹ، اور نگ آباد اور
حیدر آباد کی طرف کوچ کر گئے تھے۔ حیدر آباد میں اردو ادب اور شاعری
کا ارتقاء، مسلسل اور موجودہ زمانہ تک جاری رہا۔

بیجا پور کی مثنویاں

ابراہیم عادل شاہ کی تخت نشینی کے بعد سے اردو ادب اور شاعری کو جو روزافروں ترقی ہونے لگی تھی اس کا اجمانی ذکر بچپے باب میں گذر چکا ہے۔ اس باب میں ان مشہور اور قابل ذکر مثنویوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو بیجا پور میں تصنیف ہوتیں۔

یہ صحیح ہے کہ اس کم و بیش سو سال کے طویل عرصے میں سینکڑوں مثنویاں بیجا پور میں لکھی گئیں۔ جن کے موضوعات میں کافی تنوع ہے۔ چنانچہ مذہب، تھوڑ، فقہ، کلام، عقائد، قصص وغیرہ پر اس زمانے کی مثنویاں موجود ہیں۔ لیکن ادبی حیثیت سے ان میں چند مثنویاں ایسی ہیں جو لازوال اہمیت رکھتی ہیں۔

ابراہیم کے عہد میں سب سے پہلے کچھ مثنویاں لکھی گئیں جن کا موضوع مذہبی ہے لیکن وہ قصے کے پیرایہ میں لکھی گئی ہیں۔ ان کا مصنف مخفی ہے۔

میسمی کی دو شنویاں مشہور ہیں۔ ایک "چندر بدن و ماہیار" دوسری "سومہار کی کہانی"۔ لیکن ان دونوں میں، اول الذکر کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، اس کی دوسری منزی کو حاصل نہ ہو سکی۔ میسمی استرا آباد کا رہنے والا تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد وہ کم عمری میں بھاپور آیا۔ بعد اس نے پروشن پائی، اور اس کے شعروں سخن کے مذاق کی نشوونما ہوئی۔ ابتداء عمری سے وہ ستند شاعر سمجھا جانے لگا تھا۔

"چندر بدن و ماہیار" کو قدیم ادب میں کلایسکی ادب کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ عرب کے سلیل مجنوں، ایران کے شیرین فرماد اور پنجاب کے ہیر راجھا کی طرح دکن کا یہ قصہ لازوال ثہرت رکھتا ہے۔ اب اردو دانوں کے مذاق میں جو تبدیلی واقع ہو گئی ہے اس کے لحاظ سے فوق الفطرت اور فوق العادت داقعات کا یہ قصہ شاید اس شرق اور زرق سے نہ پڑھا جائے جیسا کہ وہ میسمی کے زمانہ میں اور اس کے عرصہ بعد تک بھی پڑھا جاتا رہا۔ تاہم تاریخ ادب میں اس کی اہمیت ہمیشہ قائم رہے گی۔ بعد کے اکثر شعرا نے اپنے کارناموں میں اس قصہ کی طرف اشارے کئے ہیں۔ مثلاً ابن نشاٹی کی "پھولین" اور سراج اور نگ آبادی کی غزلوں میں اس قصہ کی تلمیحات آتی ہیں۔ بعد کے زمانے کے ایک اور شاعر واقف نے بھی اس قصہ کو پھیلا کر لکھا ہے۔

قصے کا فاکہ اور انداز بیان دونوں دلچسپ ہیں۔ اس کا مقصد مذہب

اسلام کی عظمت ظاہر کرنا ہے لیکن یہ مقصد قصے کی دلپسی میں فارج نہیں ہوتا۔ قصے کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوجوان ماہ یار نامی، چند رہنے کے راجہ کی رڑکی چند رہنے کا نام سن کر اس پر فریفہ ہو جاتا ہے اور تلاش میں اس کے شہر چند رہنے میں پہنچتا ہے۔ ایک روزاتفاق سے دونوں کا آمنا سامنا ہو جاتا ہے۔ ماہ یار آگے بڑھ کر چند رہنے کے پیروں پر گرتا ہے اور راجہ کماری اس کو ٹھکر کر چلی جاتی ہے۔ لیکن اس کی خاموش پرستش کا اس کے دل پر کبھی اثر ہوتا ہے۔ وہ کچھ کرنہ میں سکتی تھی کیوں کہ مذہب اور رواج کی بندشیں سدراہ کھیں۔ ماہ یار اسی غم میں دیوانہ ہو جاتا ہے اور بیجا نگر کا راجہ اس کو اپنے پاس لے جاتا اور اس کی مقصد براری کا وعدہ کرتا ہے۔ لیکن چند رہنے کا باپ اپنی بیٹی کے ساتھ اس کے رشتہ کو کسی طرح منظور نہیں کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ماہ یار جدا ہوئے کے صدمہ کی تاب نہ لا کر جان دے دیتا ہے۔ جب اس کا جنازہ مدن کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو راستہ میں راجہ کے محل پر سے گذرنا۔ عین محل کے سامنے پہنچ کر جنازہ ایسا رکا کہ ساری کوششوں کے باوجود آگے بڑھنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ چند رہنے کو کبھی اس کی خبر ہوئی اور اس پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے فوراً غسل کیا اور عاشق مر حوم کا مذہب اختیار کر کے اپنے کمرہ میں جا کر کواڑ بند کر لیا۔ لوگ سمجھے کہ وہ سورہ ہی ہے لیکن یہ خواب خوابِ مرگ تھا۔ اس کے بعد جنازہ آگے بڑھا تھا۔ جب قبر میں آنے کے لئے اسے تابوت سے نکالا تو کیا دیکھتے ہیں کہ چند رہنے کی لاش بھی ماہ یار کے

آنوش میں موجود ہے۔ عاشق و معشوق کے لاثے ایک درمرے سے ایسے جھٹ
گئے تھے کہ کسی بھی طرح جدا نہ ہو سکے۔ مجبوراً دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا
اور قبر پر دولتعویذ بنادیئے گئے۔

دکن میں ایسی کئی قبریں ملتی ہیں جن پر دولتعویذ بنے ہوئے ہیں اور اطراف
و اکناف کے رہنے والے اس کے متعلق اسی طرح قصہ بیان کرتے ہیں۔ نواب
نظام علی خاں کے عہد کے ایک مورخ اور شاہزادہ تجلی علی نے اپنی ما رخ نے
”تزرک آصفیہ“ میں ایک ایسی قبر کا واقعہ لکھا ہے جو انھیں میسور کے راستہ
میں کہیں نظر آئی تھی۔ گاؤں کے لوگوں سے پوچھنے پر انھیں یہ قصہ سنایا گیا۔
جس کو وہ پر دلم کر کے لکھتے ہیں کہ خدا جانے اصل واقعہ کیا ہے لیکن قصہ یوں ہی
مشہور ہے۔

”چند رہدن و ماہ یار“ کا قصہ بعد کے اکثر تصویں کے مقابلے میں ایکی ہے۔
اس کے اشخاص اور مقام سب ہستہ و ستانی ہیں۔ اس کی تکمیل کی تاریخ ڈاکٹر
سید محمد الدین قادری زور نے ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیان مقرر کی
ہے۔ اس سے پہلے گولکنڈہ میں غواصی کی مہنگی ”سیف الملوك اور بدیع الجمال“
لکھی جا چکی تھی۔ مقیمی اپنے دیباچہ میں بیان کرتا ہے کہ اس نے اپنی مہنگی
غواصی کے تبع میں لکھی ہے۔ غواصی کا ذکر وہ استاد کی طرح کرتا ہے۔

میقہمی کی دوسری ثنوی کو زیادہ شہرت حاصل نہ ہو سکی اور اب وہ عام طور پر دستیاب بھی نہیں ہوتی۔ ”چند ربدن و ماہ یار“ مرتب اور ارق ہذا کی تصحیح سے، مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات کی طرف سے اشاعت کے لئے تیار کی گئی تھی لیکن یہ شایع نہ ہو سکی۔

ذیل میں اس ثنوی کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں محل کے لوگوں سے چند ربدن کی آخری گفتگو نظم کی گئی ہے۔

یو دکھ آج مجھ جیو کا ساتھی ہرا یو ساتی جو مجھ جیو کا گھاتی ہوا
 اتنا جگ میں رہنا نہیں خوب کام کہ اس باج جینا اپس کوں حرام
 یو دکھ نے جلا یا ہے جوانی جیون چھوڑا یا اونے آج میرا وطن
 اپس میں اپی روؤ ناخب نہیں مکھ ان جھوواں ستی دھوؤ ناخب نہیں
 میرا دکھ کہوں گی تو مرنے کا نیں دکایت میری بیگ سرنے کی نیں
 کروں جا کہ بیگی یو آپس فکر جو ہوئے خدا کا رحم کچھ مگر
 سو ہے عاشقان میں یو عاشق اول کرے قصد مل جانے پہاڑے نخل
 ملوں جا کے بیگی میں اس پار سمل جو واصل کر دوں جیوں اس یار سوں
 سو غلوت تے جیوں بھار آئی ہوں سہیلیاں کوں اپنی بلائی ملوں
 سہیلیاں منے کیس سہیلی کوں کھوں کہتی ہوں تجے میں کہ یوں جا کے بول
 کہی جا رضاۓ توں سب کی رضا میں جا کے دکھوں عاشق اہے کس وضاحت

پدر ہور مادر کو بولو سلام کرو راج شاہی، رہو تم مدام
 رداع ہے نفے ہور طبے موس آتا دداع ہے زخولیشاں قرابت جتنا
 رداع ہے عزیزاں دو بھایاں ستی دداع ہے پوکھانائ و مایاں ستی
 رداع ہے سہیلیاں رہو خوش مدام کروں جاکہ عاشق سوں کچھ ہم کلام
 خدا پاس جو میں منگی بار بار میرے بعد مل کر رہیں ایک سٹار
 دعا تو مسیری دو کیا مستحب دعا تو مسیری دو کیا مستحب
 کہی الوداع الوداع الوداع کہ ہوتی ہوں میں آج سے جدا
 سہیلیاں کھیاں یوں کہ چندر بدن تو سب سے جدا ہوتی ہے کس کدھن
 کہی یوں دونا زکر مٹھے بول سوں سو بگی ملوں جاکہ اس پیو سوں
 مقیمی کا معاصر امین تھا جس نے "بهرام و حسن بانو" نامی مثنوی لکھی
 تھی۔ اس مثنوی کا ماخدا ایران کے مشہور ہیر و بهرام گور کے نصیح ہیں۔ اس
 میں بهرام اور حسن بانو کے عشق و محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ بهرام گور
 ایران کا "کنگ آر تھر" ہے جس کے اطراف فارسی میں کئی قصے گھڑے کئے ہیں۔
 یہ قصہ اردو میں فارسی اثرات کے ابتدائی مخنوں میں سے ایک ہے۔
 امین پنے آپ کو مقیمی کا معنوی شاگرد سمجھتا تھا میقمی کی مثنوی کو پڑھنے
 کے بعد، اس کو مثنوی لکھنے کا خیال پیدا ہوا لیکن وہ اس مثنوی کو ختم نہ کر سکا۔
 بعد میں محمد عادل شاہ کے عہد کے ایک اور شاعر درلت نے اس کی تکمیل کی۔

محمد کے زمانے کے شعرا میں صنعتی، رسمی اور ملک خوشنود بہت نمایاں ہیں صنعتی کی تالیف ایک قصہ ہے، جس میں آنحضرت کے صحابی حضرت تمیم الفاری کی مہمات بیان ہوتی ہیں۔ اس کا نام ”قصہ بے نظیر“ ہے اور اس کی تکمیل ۱۰۵۵ھ میں ہوئی۔ یہ مثنوی کبھی مجلس اشاعت دھنی مخاطرات کی جانب سے مرتب اور اقہاد کی ترتیب کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ تکمیل الفاری کے قصہ کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ بعد کے چند قصہ نگاروں نے اس موضوع پر مثنویاں لکھی ہیں۔ اس طرح کی ایک مثنوی راقم سطور ہدایہ کے پاس موجود ہے، جو ”تمیم الفاری“ کے نام سے موسم اور روف پر میں مبسوئی کی مطبوعہ ہے۔ یہ کہمباہیت کے سی شاعر غلام رسول غلامی نے ۱۳۸۷ھ میں لکھی تھی۔ ذیل میں ”قصہ بے نظیر“ کا ایک دلچسپ اقتباس درج کیا جاتا ہے :

اکھا وان عجب سبز کیک مرغزار	درختاں تھے کئی بھانت کے باردار
دے سبز زنگ آسمان سی زمیں	ستاریاں سی اس میں گل یا سمیں
ہر کیک کالوا جوں کہ جل سیم کا	ورق جدول بزر پر سیم کا
کہ چپل کی جوں چکپاں میں غمزراں کی فوج	دے بل پوپاۓ اس دھات مونج
عروسان کے رخسار پر زلف جوں	دیں چیع سنبل کے لائے میں یوں
ہر کیک پات پر بوند بر سانت کے	ہر کیک شاخ پر مرغ کئی بھانت کے
جتنے مرغ وان کے خوش آواز تھے	فرشتیاں سُنج میں ہمراز تھے

اتھاگر چہ لائے نمن دل میں دانع دمکھت بانع مجھ دل ہوا بانع بانع
 کمال خاں رسمی اس عہد کے شاعروں میں ایک خاص اہمیت رکھتا
 ہے۔ اس کی مشنوی "فادر نامہ" کا موضوع عام بزمیہ مشنوی کے مقابلہ میں نیا
 ہے، اس میں حضرت علی کی جنگوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ اصل
 میں ابن حام کی فارسی مشنوی کا ترجمہ اور ایک طویل رزمیہ ہے جو بیس ہزار
 اشعار پر مشتمل ہے۔ رسمی نے اس کی تکمیل ۱۰۵۹ھ میں کی۔

ملک خوشنود کو محمد عادل شاہ کے درباری شعرا میں یہ امتیاز حاصل
 رہا کہ وہ نہ صرف ایک پرگو شاعر تھا بلکہ دربار سے زمہ دارانہ خدمات بھی
 اس کے سپرد کی جاتی تھیں۔ "اردو شہ پارے" کے مصنف نے اس کے حالات
 تفصیل لکھے ہیں۔ وہ اصل میں گوکنڈہ کا ملازم تھا جس کی پرورش محمد تالی کے
 محل میں ہوئی تھی۔ خدیجہ سلطانہ کے ساتھ یہ بجا پور آیا جہاں اس کی کافی
 غزت کی جاتی تھی۔ پھر ۱۰۲۵ھ میں محمد نے اپنے وزیر خواص خاں کے مقابلے
 میں عبداللہ سے مدد طلب کرنے کے لئے اس کو سفیر بنایا کہ گوکنڈہ بھیجا گوکنڈہ
 میں اس کا استقبال نیا پت شاندار ہوا اور جب وہ والیں بجا پور جانے لگا تو
 مشہور شاعر غوثاصی کو اس کے ہمراہ بھیجا گیا۔

اس کی دو مشنیاں "ہشت بہشت" اور "یوسف زینیا" مشہور ہیں۔
 اول الذکر کا ایک خطوط برش میوزیم میں محفوظ ہے لیکن دوسری نایاب ہے۔

یہ دونوں مثنویاں امیر خسرو کی مثنوی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ ملک خوشنود کا انداز بیان کس قدر مشکل ہے۔

علی عادل شاہ ثانی کے دربار میں کئی اچھے اچھے اور خوش بیان شاعر موجود تھے۔ اس پایہ کے شعرا، کا مجمع اس سے پہلے کسی دربار میں نہیں تھا۔ نصرتی جس کی فن کاری کے باعث اردو مثنوی جزئیات کی شرح و سبط مکالمہ اور واقعات کی ڈرامائی طرز پیش کشی سے روشناس ہوئی، اسی دربار کا ملک الشعرا رکھتا۔ وہ قدیم شاعری کے سب سے بڑے اتادان فن میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے حالات اور شاعری کے متعلق، مولوی عبدالحق صاحب نے ایک محققانہ اور بھیرت افروز مضمون رسالہ اردو (اورنگ آباد) میں شایع کیا کوئا جواب علیہ کتاب کی صورت میں طبع ہو چکا ہے اور کتاب نصرتی کے نام سے موسوم ہے۔

نصرتی کے کارناموں میں کئی قصائد کے علاوہ دو دلخیسپ مثنویاً شامل ہیں۔ ان میں سے ایک "علی نامہ" تازہ ترینی رزمیہ ہے۔ اس میں علی عادل شاہ، مغلوں اور شیواجی کی جنگوں کے نہایت موثر مرقعے پیش کئے گئے ہیں۔ نصرتی کا انداز بیان اگلی تمام مثنویوں اور بعد کی اکثر مثنویوں کے مقابلے میں بہت ترقی یافتہ ہے۔ یہ کارنامہ مولوی عبدالجید صدیقی سابق پردیس تاریخ جامعہ عثمانیہ کی ترتیب اور عالمانہ مقدمہ کے ساتھ مجلس اشاعت رکھنی مختوطات

کی سرپرستی میں شایع ہو چکا ہے۔ نصرتی کی دوسری مثنوی "گلشن عشق" ایک بزمیہ نظم اور داستان ہے جس میں اس کے رزمیوں کا زور قلم بڑی حد تک موجود ہے۔ رزمیہ اور تصیدہ بھگاری کا نصرتی پر اس قدر گھرا اثر تھا کہ مثنوی میں مناظر کے مرقعے پیش کرتے ہوتے بھی وہ شاندار اور پرشکوہ انداز سے پہلو نہیں بجا سکتا۔ اس خصوصی میں ابن نشاٹی نصرتی پر فوقیت رکھتا ہے کیوں کہ اس کے مناظر کے بیان میں زیادہ گھلادٹ اور شیرینی ہوتی ہے۔ "گلشن عشق" مولوی سید محمد مصنف "ارباب نثار درو" کی ترتیب اور مقدمہ کے ساتھ مجلس مذکور کی سرپرستی میں شایع ہوئی ہے۔

ذیل میں "گلشن عشق" کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں عاشق و عشوق کی ملاقات کا حال درج ہے۔

پچھیں وہ سلکھن بیہتیا رہو لگی پوچھنے اس سوں سدھار ہو
کہ ہے کروں توں اے سلکھن سوچان مشنیل ٹھوار میں آسکیا ہے یہاں
یقین جانتی ہوں قیاس و خیال کہ پھاں آدمی زاد آنا محال
پرانیں تو بیچ مج اچھے گا ملک سبب کیا جو آیا اتر کر فلک
دیا ہر جگہ جوت تارے من کنانچ ہے پہلا کہ چوکف اگن
عجب ہوں جو کس پر دکھانے کوں دا ب وہ دو میں کا یک توں ٹوپیا سو شہاب

دلے کچ تو ہے تجھ پر غم کا گر ان
 تجھے سوں ہے پیدا کرن ہار کی
 کنایت سچ تو یوں بات اچھی سار کی
 سنبھال لکھن تے من ہرنے بات
 کہ میں سچ نہ ہوں آدمی زاد من
 پن اول ہے کرتا رکی تج پر آن
 سزاوار ہے تج کوں کہنا تو حور
 پریاں کہ مگر دل پر دینے کوں داع
 سہیلی یوسن بات، سہی بے حساب
 کہ ہوں میں بھی اک آدمی زاد تن
 کہ دن تو نھیں کے دفتر کوں باز
 کنایت سچ تج حال فی الحال اول
 کنور گر چ کوشش کیا بہوت دھات
 ہلا سیس کہنے لگا بالضرور
 نصرتی نے علی عادل شاہ کی مدح میں کمی قصیدے بھی لکھے تھے۔ اس
 کی طبیعت کی اتنی اور قادر الکلامی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکے گا کہ ”علی نما“،
 کے عنوانات جو منظوم ہیں، اگر ایک جگہ کر لئے جائیں تو ان سے ایک قصیدہ
 مرتب ہو جاتا ہے۔

شاہ ملک جو اس عصر کا دوسرا مشہور شاعر تھا اپنی مذہبی نظموں کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی مشہور تصنیف "احکام الصلوٰۃ" مذہبی حلقوں میں عرصہ تک مقبول رہی۔ چنانچہ اس کے کئی مخطوطے مختلف کتب خانوں میں دستیاب ہوتے ہیں۔ "احکام الصلوٰۃ" کی مقبولیت کی وجہ سے اکثر شعراء نے مذہبی موصوعات پر نظمیں لکھنی شروع کی تھیں۔

حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ کی شخصیت اس عصر کے شعراً میں سب سے
مقدس ہے۔ آپ حضرت شاہ بہان الدین جانم کے فرزند اور خلیفہ تھے۔
آپ کے اسلام کی طرح آپ نے بھی سلوک اور معرفت میں کئی رسائلے ارشاد
فرمائے ان میں چند منظوم ہیں اور کچھ نثر میں ہیں نظم میں آپ نے کچھ جدیں
بھی کیں مثلاً آپ کی نظم جو "محب نامہ" یا "محبت نامہ" کے نام سے موسوم ہے
غزل کے قافیہ کی ترتیب رکھتی ہے۔

قدم اردو میں اس طرز کی نظمیں کم دستیاب ہوتی ہیں۔ یہ نظم اس بات
کا ثبوت ہے کہ زبان اردو میں پہلے کی پہلی بہت زیادہ وسعت پیدا ہو گئی تھی۔
چنانچہ محب نامہ جو کافی طویل نظم ہے، اس میں قافیہ اور ردیف کے النام میں
دشواری پیش نہیں آتی۔ تاہم ان کی پابندی اب کبھی بہت زیادہ آسان چیز
نہ تھی۔ اس لئے آپ نے ہر دو شعر کے بعد قافیہ تبدیل کر دیا ہے۔

حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ سے کئی شنریاں مسوب ہیں، جن میں

"رموزالسالکین"، "نظم وجودیہ" اور "نظم قربیہ" وغیرہ مشہور ہیں۔ لیکن داقعہ یہ ہے کہ اس خاندان کے ارشادات عمر مآ ایک جگہ لکھے ہوئے ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر خلط ملٹ ہو گئے ہیں کہ بجز چند نظموں کے، باقی کے متعلق کیسوں کے ساتھ کچھ کہنا ذرا مشکل ہے۔ بعض نظموں کے نام میں بھی تھوڑا بہت اختلاف ہے۔ مثلاً "رموزالسالکین" کو "رمزالسالکین" اور "نظم وجودیہ" کو "نظم وجود" اور "محب نامہ" کو "محبت نامہ" بھی لکھا گیا ہے۔

یہ ظاہر ہے کتابت کے جزئی اختلافات ہیں۔ ان کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ امین نے اپنے دادا اور والد کے اقوال اور ارشادات کو خود تحریر فرمایا تھا۔ چنانچہ اسی طرح کے ایک مجموعہ میں جو کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہے، رموزالسالکین بھی شامل ہے۔ "رموزالسالکین" کے ختم پر کتاب کا ترجمہ ہے "تمت تمام شد گفتار صاحب شمس العاشق، این کتاب رموزالسالکین"۔

حالانکہ مجموعہ کے آخری اشعار میں حضرت شاہ امین الدین کا تخلص بھی آیا ہے۔

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے مخطوطے میں جملہ بارہ رسالے ہیں، جن میں سے بعض نظم میں اور بعض نشر میں ہیں۔ چند رسالے نظم اور نثر دنوں پر مشتمل

ہیں۔ ذیل میں ”روز الساکین“ کا ایک اقتباس پیش ہے :

اللہ پاک منزہ ذات	اس سر صفات اور قائم سات
علم ارادت قدرت بار	سنّتا دیکھتا، بولنہار
ہے صفت یہ جان حیات	اس کو ناہیں کہ ممات
ایسی صفات سونہے ذات	جوں کے چند ناچند شکھات

آگے وحدتہ اور نور و روح اور دل و نفس پر بحث کی گئی ہے۔ اور
وحدت الوجود، فراق، فنا و بقا کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ اسی ضمن میں
ادنی اور اعلیٰ، عاشق اور نبوت اور ولایت کے فرق کو اس طرح بیان کیا
گیا ہے :

ادنی عاشق اعلیٰ بوج	یہ دو مقصود رکھوں تج
عاشق ادنی جوں پتنگ	اعلیٰ مومن بتی کارنگ
جوں پتنگا دیکھ پڑانا	آپ جل کر ہوئے فنا
ولے ولایت جوں پتنگ	مومن بتی یہ نبوت رنگ
حق کے نامہ پکڑ یقین	کیوں نا اس کوں ہوئے ایں
تمت اس تین کیا تمام	حق تھے بولیا حق کلام
بیجا پور کے عہد زریں کا آخری سخن پر داڑہ ہائی ہے جو طبری پر گوشا عزیز	
تھا مشہور ہے کہ وہ اندر ہاتھا۔ اس نے کئی تصنیفات چھوڑی ہیں، جن میں	

غزلوں کا ایک ضمیم دیوان اور ایک دیوان رخنی، کئی مرثیے اور ایک شنوی "یوسف زلینا" شامل ہے۔ یہ شنوی کافی شهرت رکھتی ہے اور اب مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی ایم۔ اے۔ (عثمانیہ) کی تصحیح سے، مجلس اشاعت دھنی خطوطات کی جانب سے شایع ہو چکی ہے۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

کہ جس طھاؤں او عاشق نیک نام ایکیلا رہیا جو انھا کر مقام
 سرو دطھاؤں او تارچ کچ طھار تھا جنت کے گھستان کے سار تھا
 کھلے تھے کیتا جنس کے بھول وان بو کے بن نہ تھی نازوں کوں دھول وان
 دبے تھے چمن سر بسر بھول ، میں کتے جنس کی باس ہر بھول ، میں
 پوئن باج وان کوئی مالی نہ تھا کسی بھول تھے بن دو خالی نہ تھا
 کہیں رائی چنپا کہیں سیونتی کہیں موگڑہ ہو رکہیں رینوتی
 کہیں یا سمن ہو رہ مدن بان کیں کہیں تاج سرخ ہو رہ بیان کیں
 کہیں لال ہو رکہیں رنگیے گلاب کیتا جس منے بھول کیتے کلیاں
 کہیں تختے انگور کے بے بدل کیتا جس تو نین کوں انھیں گدھلیاں
 کیں ان بھیر د آنا رشیریں بھیں کیتا جس کے میوے خوش باس خوب
 کیں سبب ہو رکہیں انناس خوب کیں جوز چلغوز دستے نفیں

خوش ایسے اچنپے گستاخان میں لگیا سیر کرنے اپن دھیان میں
ٹھنڈی کجہ ہواداں کی جو اس کوں بھائی سوک جھاڑتی خوش اسے نیند آئی
اس زمانے کے دوسرا شاعر دو میں سے ایک ایسا غنی تھا جو مدد ہی نظریں
لکھا کرتا تھا۔ اس کی شمنوی "نجات نامہ" مشہور ہے جس کے کئی لشکن یورپ
اور ہندوستان کے کتب فانوس میں دستیاب ہوتے ہیں۔

عادل شاہی خاندان کے آخری حکمران سکندر (۱۰۸۳ھ - ۱۰۹۷ھ)
کا عہد حکومت نہایت پریشان کرن رہا۔ اس نے کل چودہ سال حکومت کی لیکن
اس عرصے میں اس کے ساتھ سارے ملک کو آرام اور چین کے بہت
کم ایام میسر آسکے۔ اسی کے زمانے میں اور نگزیب نے یجا پور پر چڑھائی
کی اور اس کو معزول کر کے یجا پور کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔

سکندر کے عہد کے دوشا عرشہور ہیں۔ ایک سیوا جس نے
فارسی "روفتحة الشہدا" کو اردو کا جامہ پہنایا تھا اور دوسرا موتمن جس نے
حضرت سید محمد جونپوری کے حالات اور ملفوظات پر ایک طویل شمنوی "امراء
عشق" کے نام سے لکھی تھی۔ یہ امر کہ سکندر کے عہد کے اکثر شعراء مدد ہی موصوعات
پر نظریں لکھنے لگے تھے، اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کو دنیوی مال دولت پانے
کی اب بہت کم توقع رہ گئی تھی۔ اسی لئے انہوں نے اپنے کمال کو مذہب کی
خدمت کے لئے وقف کرنے میں اطمینانِ قلب اور اخروسی ثواب کا ذریعہ

سمجھا۔ یہ خصوصیت بعد کے شاعروں کے کارناموں میں اور بھی نمایاں ہو گئی ہے۔

عادل شاہی سلطنت کے فاتحے کے بعد بیجا پور کے کچھ اہل علم اور شاہزادے قدردان کی تلاش میں گورکمندہ بھی چلے آئے تھے جہاں ان کے کمال کی قدر دانی اب بھی ہو سکتی تھی لیکن یہاں بھی وہ زیادہ عرصہ تک چین کی زندگی نہ بس رکسکے۔

گولکنڈہ کی مشتوفیاں

چوتھی فصل میں ہم محمد قلی کے عند، اس کی شاعری اور علماء اور شعرا کی سرپرستی کا محفل طور پر ذکر کر چکے ہیں۔ محمد قلی غالباً پہلا اردو شاعر ہے جس کی غزلوں کا دیوانِ دستیاب ہو سکا ہے۔ اس ضخیم کلیات میں مختلف اور گوناگون موضوعات پر نظمیں موجود ہیں۔ لیکن اس نے نظم کا کام بھی ثنوی کے بجائے قصیدے یا غزل کی صفت سے لیا ہے۔ حمد، نعت، مدھبی تقریب و مخلات کی تعریف، نوروز اور بسنت وغیرہ پر اس کی کئی کئی نظمیں ہیں، جو غزل اور قصیدے کے قافیہ کی ترتیب میں لکھی گئی ہیں۔

محمد قلی کے درباری شاعر، وحبی کا یا یہ قدیم ادب میں نہایت بلند ہے۔ وہ بے مثل شاعر اور انشا پرداز تھا۔ ”سہرس“ جو اس کی انشا پردازی کا عمدہ نمونہ ہے۔ غالباً اردو کی سب سے پہلی ٹھیک ادبی تصنیف ہے۔ انشا پردازی میں وحبی کا ایک خاص اسلوب تھا، جس میں لفظی صنعتوں اور

معنوی خوبیوں کو نہایت عمدگی سے سمو یا گیا ہے۔ وہ پے در پے متفقی اور
مسجد جلے لکھتا چلا جاتا ہے، لیکن عبارت کی روانی میں کوئی فرق نہیں آنے
پاتا۔ اس کے کئی جلے ایجاد خیال اور نزاکت انہمار کے لحاظ سے ضرب المثل
کی اہمیت رکھتے ہیں۔ جدید اردو کے صاحب طرز انشا پردازوں میں صرف
محمد حسین آزاد کا اسلوب دھبی کے اسلوب سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس
قابلِ قدر کارنامہ کو مولوی عبدالحق نے نہایت عالمانہ مقدمے کے ساتھ
انجمن ترقی اردو کی طرف سے شایع کیا تھا، لیکن اب اس کے کئی اطیشنا
نخل چکے ہیں اور یہ کارنامہ تقریباً ساری یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل
ہے۔

دھبی کی انشا پردازی کی طرح اس کی شاعرانہ قابلیت بھی بے مثل
تھی۔ اس کی مثنوی "قطب مشتری"، محمد قلی کے زمانہ شہزادگی کے عشق
کی داستان مانی گئی ہے۔ اس مثنوی کے نسخے کمیاب تھے لیکن مولوی
عبدالحق مرحوم نے اسے انجمن ترقی اردو کی جانب سے شایع کر کے، اب
سارے طالبانِ ادب تک پہنچا دیا ہے۔ ڈاکٹر زوراں کے مصنف کے
بارے میں اپنی تصنیف "اردو شہ پارے" میں رقمطراز ہیں : "دھبی کئی باول
کے لحاظ سے دکھن کا ایک واحد ادیب ہے۔ اس کا موضع خود اس کے
ذہن کی پیداوار ہے۔ اس کو اس بات پر فخر تھا کہ اس نے اور شاعر دن کی

طرح دوسروں سے مضمون اخذ نہیں کیا؛
 میر تقیٰ میر کی طرح و جھی بھی بہت نازک مزاج تھا۔ چنانچہ نوجوان شاعر
 پر اس نے ”قطب مشتری“ میں جا بجا چوٹیں کی ہیں۔ نو عمر شرار جو و جھی کا ہدف
 رہے ہیں، ان میں غواصی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ”قطب مشتری“ کے
 کردار ”سب رس“ کی طرح مثالیہ ہیں اور ان میں اجرام سماوی کے ساتے
 نام ”قطب“ کی رعایت سے لائے گئے ہیں۔ ذیل میں قطب مشتری سے ایک
 اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ اس سے و جھی کی قادر کلامی کے علاوہ شعر کے
 متعلق اس کا بلند معیار بھی ظاہر ہوتا ہے۔

گتا ہوں تجے پند کی ایک بات کہ ہے فائدہ اس منے دھات دھات
 جو بے ربط بولے تو بتیاں چیزیں^{۲۵}
 بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
 سلاست نہیں جس کیری بات میں
 پڑا جائے کیوں جذکر ہات میں
 جسے بات کے ربط کا نام نیں
 نکو کہ تو لئی بولنے کا ہو س
 اگر خوب بولے تو یک بیت بس
 اسی لفظ کوں شعر میں لیاے تو
 کہ لیا یا ہے استاد جس لفظ کوں
 اگر فام ہے شعر کا تج کوں جھنڈ
 چنے لفظ لیا ہو ر معنے بلند
 رکھیا اک معنی اگر زور ہے
 دلے بھی مزا بات کا ادر ہے
 اگر خوب مجرب جیوں سور ہے
 سنوارے تو نور علی نور ہے

گر لاکھ عیباں اچھے نار میں ہنر ہود سے خوب سنگار میں
 ہنر مشکل اس شعر میں بوج ہے کہ تھوڑے اچھیں صرف معنی سو کئے
 دیو انا ہوں میں اس زنگی بات کا کہ ہر دل میں جیو ہو کرے کھار کرے
 کہاں بات وہ پچل ہور حلبی کہ دل کوں نخواں سو کرے گدگی
 سخن گو وہ ہے جس کی گفتار تھے اچھل کر پڑے آدمی ٹھار تھے
 نکر بول مضمون تو ہورے کا کہ کالا ہے دوجگ میں موں چور کا
 جتنا چتا چوری کر چورا پیج ساؤ ہوئے دغا باز، اچکے کوں مانے نہ کوئے
 چرا کر، چراتا نہ کے چور رکھی یو باتاں سمجھتے سوہیں ہور کی
 محمد قلی کے عهد کی دوسری اہم ثنوی "یلی مجنوں" ہے جس کا مصنف
 محمد قلی کے زمانہ کا ایک شاعر احمد ہے۔ عرب کے اس عاشق و عشوق کی
 غیر فانی داستانِ محبت سینکڑوں دفعہ رہ رانی جا چکی ہے لیکن اس قصہ کیں
 کا لطف کبھی کم ہونے نہیں پاتا۔ اور ہر زمانے کے شعرا، اس کو نئے نئے انداز
 سے پیش کرتے رہتے ہیں۔ احمد کی "یلی مجنوں" کے مخطوطے کمیاب ہیں۔ پروفیسر
 حافظ محمود شیرانی کے پاس اس کا ایک نامکمل مخطوطہ موجود تھا جس سے کچھ
 اقتباسات موصوف نے "پنجاب میں اردو" میں دیے ہیں۔ ذیل کے اشعار
 "پنجاب میں اردو" سے نقل کئے جاتے ہیں۔ یہ حصہ سبب تالیف سے متعلق ہے:
 جو منج بخت کو فتح یا در ہوا سو منج بخت کا سیوک اندر ہوا

جو شہ آپ تھے آپ منج یاد کرے منجے غم کی بندگی تھے آزاد کرے
 دیتے امر عالی کے یہ باغ لاوں جو پالوں اسے شہ امریت نانوں
 جو میں شاہ کا امر سر پر لیتا ترت باغ لانے شتابی کیت
 بھوتیک پریشانی روزگار اگرچہ منجے ہے علالت سو بار
 بھوتیک شغلان سیتی رات دن نہ کھی منج فرست بھلڑیک بن
 دھریں دھر شہ کے فرمان پر لگیا تن سنگارن بھوقہ دھر
 دھریں عشق کی باس اسکے بن کھول جو اس بس پر جوں بھنور جگئے کھول
 سوچ عشق کوں اب جگت میں جگاؤں جو گھر گھر تے لیلی و مجنوں اچاؤں
 جو لیلی و مجنوں تھے بولوں پر اں سوتازہ کروں اب انوکھا پر اں
 عافظ محمود شیرانی نے احمد کے معاصر ایک اور شاعر عاجز کا تذکرہ بھی کیا
 ہے۔ اس کی شنوی "لیلی مجنوں" جو ۱۹۲۶ء کی تصنیف ہے اب دستیاب ہو گئی
 ہے اور ڈاکٹر غلام عمر خاں استاد اردو، عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے عالمانہ
 مقدمہ کے ساتھ اسے مرتب کر کے شایع کیا ہے۔ لیلی کے مجنوں کے ساتھ
 مکتب میں پڑھنے کی تفصیل، اس شنوی سے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔
 کئے مشورت دو کیلے ہو کر دیکھے ایک کو ایک باہم دگر
 لئے دل کیس کا سوکیک ہات میں اچھیں ایک ہو ایک کی بات میں
 کیس کوں دیکھے ایک، ہو دل بدل نظر وح پرنا اچھے ایک

دو تختی سولیلی کے مکھ کی کرے دونوں والقلم ابر و اون دیکھ پڑے
 کھڑے مل سو دونوں الف لام مسیم ہوئے بیتلانت المسوں ندیم
 سمجھے الف قیس کوں قدغبیر نسلیلی دراں کس سوں کھیلے دگر
 محمد قطب شاہ کے دربار کی ادبی چہل بیل پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس
 کے عہد کے بہت کم کارنامے دستیاب ہوتے ہیں۔ صرف ایک شاعر حسن
 شوقی کا ذکر "اردو شہ پارے" کے مصنف نے کیا ہے۔ "بھول بن" کا مصنف ابن
 شاطی اپنے پیش رو اساتذہ کے ذکر میں حسن شوقی کا بھی نام لیتا ہے۔ اس میں
 شبہ نہیں کہ شوقی بلند پایہ شاعر تھا۔ چنانچہ اس کی دو مشنیاں قابل ذکر ہیں۔ ان
 سے اس کی طبیعت کی جدت اور قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ پہلی مشنوی "ظفر
 نامہ نظام شاہ" میں اس نے اپنے عہد کی اس تاریخی جنگ کے حالات شاعر
 انداز سے بیان کئے ہیں، جو دیکھیا نگر کے راجہ رام راج اور دکن کے دوسرے
 مسلمان حکمرانوں کے درمیان ہوئی تھی۔ دوسری مشنوی "میر باñی نامہ سلطان
 محمد عادل شاہ" کا موضوع بھی ایک تاریخی واقعہ ہے۔ محمد عادل شاہ کی شادی
 اس کے وزیر صطفی خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ شوقی نے اس شادی کی تفصیل
 لکھی ہے اور واقعات کو نظم کرتے ہوئے اس زمانے کی رسم درداج اور
 معافشہ پر بھی رشنی ڈالی ہے۔
 اس عہد کے اختتام سے پہلے ایک اور شاعر کا ذکر ضروری ہے،

جس کا تعلق اس میں شک نہیں کہ گوکنڈہ سے نہیں تھا۔ تاہم اس نے اپنی نظم اسی زمانے میں لکھی۔ یہ محمد افضل ہیں۔ جن کی "بکٹ کہانی" مشہور ہے۔ قدیم اردو شاعری کا نشوونماز یادہ تر دکن میں ہوا۔ اس لئے بعض تذکرہ نگاروں نے افضل کو بھی دکنی سمجھا۔ لیکن اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ پانی پت کا رہنے والا تھا۔ اس لحاظ سے غالباً یہ اس زمانے کا واحد شاعر ہے جس کا دکن سے تعلق نہیں ہے۔ "بکٹ کہانی" کوئی بسیط کہانی نہیں بلکہ "بارہ ماںہ" ہے جس میں ایک فراق زدہ عورت سال کے بارہ مہینوں میں سے ہر ہی نے میں اپنے بڑہ کا دکھڑا اثر انداز پیرا یہ میں بیان کرتی ہے۔ یہ نظم بھی شنوی کی شکل میں ہے۔ اور اب اسے ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے مرتب کر کے شایع کر دیا ہے۔ لقول شیرانی "اس نظم میں فارسی بندشیں جاوے جا باندھی گئی ہیں۔ ایک مھرے کی بندش آدھی فارسی میں ہے آدھی ہندی میں۔ حتیٰ کہ افعال و ضمائر فارسی سے بھی بے تخلیف کام یا گیا ہے اور فارسی سے جاوے جا مدد لینے کی ضرورت، اس کا ثبوت ہے کہ شمال میں اردو میں مروط نگاری ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ دکن میں اردو زبان دراصل اس وقت کے ساتھ مختلف موضوعات کے لئے استعمال کی جاتی رہی تھی کہ سکھنے والوں کو ایک طرح کی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ اور انھیں خواہ مخواہ فارسی کے الفاظ اور ترکیبیوں کو شامل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

”بکٹ کہانی“ کا ایک اقتباس ذیل میں منقول ہے:

سنوں سکھیو بکٹ میری کہانی بھئی ہوں عشق کے غم سوں دوائی
 نہ مجھ کو سوکھ دن نہ نیں دراتا بڑھوں کی آگ سے سینہ چراتا
 تمامی لوگ مجھ بوری کہیں رہی خردگم کر دہ و مجنوں کہیں رہی
 نہیں اس درد کا دار و کسی کن بھئے چران سبھی حکما رذوفن
 اری جس شخص کوں یہ دیو لے گا سیانان دیکھ اس کوں دور بھاگا
 اری یہ ناگ جس کوں ڈنگ لادے
 کہ جس کی آگ میں سبھ جگ جلا ہے اری یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے
 بڑھوں کی آگ تُن من میں دکی ہے دہی جانے کے جس کے تن لگی ہے
 چہ داند درد دیکھ را درے بیسر بُوا یکلی نہیں جس شخص کوں پیر
 جلے جیورا مرانت آگ یہ میتی پھٹی بوری بڑھوں بیرگ سہتی
 نہیں یک دم مجھے دن رین میں چین بُوا یہ مثنوی مکار ہوئے جنہوں نے مثنوی کے فن کو خاطر خواہ ترقی دی محققین
 سلطان عبداللہ کے عہد کے شعرا میں، غواصی اور ابن نشاطی رونہایت
 بلند پایہ مثنوی مکار ہوئے جنہوں نے مثنوی کے فن کو خاطر خواہ ترقی دی محققین
 ان دونوں کے کارناموں کو اہمیت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کے کمال کی
 وجہ سے انھیں نہ صرف اپنے زمانے کے بلکہ اردو زبان کے غیر فانی شعرا میں
 شمار کرتے ہیں۔

غواصی کی ایک "منزی" "سیف الملوك و بدیع الجمال" کا مخذلف لیلہ
کا مشہور قصہ ہے۔ یہ دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اسلوب کی سلامت، روائی،
اور شعری نزاکتوں کی بدولت یہ قدیم منزویوں کے مقابلے میں نایاں طور پر
ترقی یا فتحہ منزی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی تصنیف کا سنہ ۱۰۳۵ھ ہے۔ یہ منزی
اب مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات کی سر پرستی میں مولوی پیر سعادت علی رضوی
صاحب ایم۔ اے۔ (عثمانیہ) کی ترتیب اور صحیح کے ساتھ شایع ہو چکی ہے۔
غواصی کی دوسری "منزی" "طوطی نامہ" سنگرت کے مشہور حلقة قصص
"شکاسب تی" سے ماخوذ ہے۔ لیکن غواصی کا ماخوذ فارسی ترجمے تھے۔ یہ چار
ہزار اشعار کی نہایت طول طویل منزی ہے جس کی تصنیف کا سنہ ۱۰۵۹ھ ہے۔
ذیل میں "سیف الملوك" سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے جو سب
تالیف متعلق ہے:

میرا گیان عجب شکرستان ہے جو اس تے مٹھا سب ہندستان ہے
جتنے ہیں جو طوطی ہندستان کے شکر کھا میرے شکرستان ہے تھے
مشھ بول اٹھے اوپس گیان تھے زاکت کوں میں آپ لٹھی خیال تھے
دکھایا ہوں باریک کر بال تھے دیا مازگی شعر کی دفات کوں
سمحر کر دکھایا ہریک بات کوں لطافت منے میں سخن سنج ہوں
دھرن ہریک غیب کے گنج ہوں

جو میں ہم سے طبع آزمائی کروں تو ساریاں اور پیشہ رائی کروں
کہوں تمازے مضمون یک تمل منے کے بے حد اُبنتے ہیں منجہ دل منے
ہنر کی گوئی کا سو میں باگ ہوں بھن کے اتم گنج کا ناگ ہوں
سکے کون ملنے میرے طور میں کہستم ہوں میں آج کے دور میں
میری جیپ اک کھرگ ہے آب دار سدا یزراپی دھرے بے شمار
عطار و سوکلاں ہے مجھہ ہات کا دوات ہے سو میرا چندر رات کا
لگن سالوں دفتر میرے شعر کے ستارے سو جوہر میرے شعر کے
جو کچھ تشبیہاں خوب معقول ہیں میرے خیال کے بن کے وہ پھول ہیں
میری طبع کا جھاڑ جم لاوے بار کھلے پھول تسوں کوں ہزاراں ہزاراں
”پناستونتی، غواصی کی ایک اور دلچسپِ ثنوی ہے، جسے ڈاکٹر
غلام عمر خاں استادار دو عثمانیہ یونیورسٹی نے بڑے سلیقے سے مرتب
کر کے شایع کیا ہے۔

غواصی کے کار ناموں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ عمد آفرین ثابت ہوئے۔
ان کی بدولت قدیمِ ثنوی نگاروں کے سامنے ثنوی کا ایک مبنِ معيار قائم ہو گیا
جو فارسی کی ترقی یافتہ ثنوی کے تمام فنی نکات اور خصوص ہندوستانی ذہانت
کا مجموعہ تھا۔ غواصی کی شہرت اس کی زندگی ہی میں دور تک پھیل گئی تھی جیسا کہ
بجا پور کا مشہور شاعر عربی اپنے آپ کو اس کا خوشہ چیز بتلاتا ہے۔ اور عربی بجا پور

میں ترقی یافتہ مُنزوی نگاروں کا پیش رہے ہے۔ چنانچہ اس کے معاصرین میں این خود کو مفہومی کاشاگر سمجھتا تھا۔ اردو کے قدیم ترین تذکرہ نگار بھی، جو بہت سے قدیم شعرا کے حالات سے ناواقف تھے، غواصی کی شہرت سے روشناس ہو چکے تھے۔

مُنزوی کے فن کو ترقی دینے میں غواصی کا معاصر ابن ناطی بھی اس کے روشن بدروش تھا۔ گواس کو وہ شہرت حاصل نہیں ہو سکی جو غواصی کو نصیب تھی۔ انھیں دونوں کی کوششیں سے اردو مُنزوی، فارسی کی مقابل بن گئی اور متاخرین نے انھیں کو اپنا نمونہ بنایا۔

ابن ناطی کے حالات پر دہ خفا میں ہیں۔ لیکن اس قدر پتہ ضرور چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا مستند انشا پرداز اور شاعر تھا۔ اس کی شہرت کی بنیاد اس کی مشہور اور مقبول مُنزوی "پھول بن" ہے جس کو اردو تے قدیم میں کلائیکی مُنزوی کا رتبہ حاصل ہو چکا ہے۔ یہ ۶۰۰ھ کی تصنیف ہے۔ "پھول بن" کا مخوذ، ابن ناطی نے ایک فارسی مُنزوی "بسابین" بتایا ہے لیکن یہ مخفی ترجمہ یا تلمیح نہیں ہے۔ بلکہ مصنف نے تصے کے فا کے کو اپنے زمانے اور ماحول کے چوکھے میں بھایا ہے۔ چنانچہ اس کے اثنیا ص قصہ، طرزِ معاشرت کے لحاظ سے اس کے عہد کے انسان ہیں۔ مُنزوی میں جگہ جگہ قطب شاہی سلاطین کے محلات اور باغوں سے جزئیات اخذ کئے گئے

ہیں۔ انداز بیان اور سلاست میں یہ غواصی کی تہذیب سے مختلف نہیں ہے۔ "پھول بن" سنسکرت اور عربی کے تصویں مثلًاً بید پائے کے حکایات اور "الف لیلہ" کے "قصہ در قصہ" کے اصول کی داستان کا عدہ نمونہ ہے۔ یہ شنوی بھی مجلس اشاعت دہنی مخطوطات کی جانب سے مرتب اور اقہادا کی ترتیب کے ساتھ شایع ہو چکی ہے اور اس کا ایک ادبیں اجمن ترقی اردو (کراچی) سے جناب شیخ چاند محمد نے اپنے مقدمہ اور ترتیب کے ساتھ شایع کیا ہے۔ ذیل میں بلبل کے جال میں گرفتار ہونے کا واقعہ شنوی سے اخذ کر کے درج کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں آسمان کی شکایت کی گئی ہے۔

فلک ایک دام ہے دانے سوتارے کہ کام دام کے ہیں اس میں سارے فلک کے دام تے غافل نہ اچھنا کبھی اس کام تے غافل نہ اچھنا ہے خاصاً فعل اس کا بے وفا کی صبا اوٹ کر سرچ کے تیس جلانے چیخ ستاریاں کوں کر ہبیں رکھتا کدھیں نیں نڑیا ہو جو گئی بیٹھے ہیں ڈیرے پنجم کے چاند کوں نس دن گلائے بدلت کوں امن دیتا نیں گھٹی کہیں نبات النعش کر ان کوں بکھیرے سے جوزا کے نمنے ان کوں کر دو خوشی سوں بیٹھ جو گئی گاپ پسارے دو بلبل جو دیکھا کیا بار دانے پڑے ہیں جا بجا اس گھار دانے

کہا طالع دیئے ہیں آج یاری کے ہیں بخت مجہ سوں سازگاری
 مگر کیا برج میں میرے چندر ہے ستارے کامرے مجہ پر نظر ہے
 بہت راحت سوں کھا کر آج چارا کروں گا پھول کا بارے نظارا
 سگیا کھانے کوں دوجو بیگ پگ رک پڑا یا پھاند اگلے میں آیکا یاک
 اس زمانے کے دوسرے منوی نگاروں میں سے ایک جنیدی بھی تھا
 جس کی منوی "قصہ الجسمہ" صنعتی کے "قصہ بے نظیر" کی طرز کا قصہ ہے۔
 ۱۰۹۷ء میں یہ مرتب ہوئی اور عام طور پر اس کے مخطوطے دستیاب ہو جلتے
 ہیں۔ لیکن اس کی دوسری منوی "ماہ پکر" اب نایاب ہے، جس کا ذکر اسٹیوار
 نے اپنے کیٹلائگ میں کیا ہے۔

قطب شاہی خاندان کے آخری حکمران سلطان ابوالحسن کا عہد
 جیسا کہ اور بیان کیا جا چکا ہے علم و ادب کی پیداوار اور ترقی کے لحاظتے
 کچھ ہمہت افراہ نہیں تھا۔ تاہم وہ ذوق ادب جو گذشتہ دو سو سال کے عرصہ
 میں پایا تھا اور ملک کے طول و عرض میں پھیل چکا تھا اس کے آثار
 اب بھی باقی تھے۔ چنانچہ اس زمانے کے شوار میں طبعی کو خاص شہرت حاصل
 تھی۔ طبعی ایک مشہور منوی "بہرام اور گل اندام" کا مصنف ہے جس کو
 بعض محققین غواصی اور ابن نشاطی کی منویوں کا ہم پلہ سمجھتے ہیں جو حقیقت میں
 طبعی گولکنڈہ کا آخری بڑا شاعر ہے۔ اس کے بعد منوی نگاروں میں اس پایا

کا شاعر پیدا نہ ہو سکا۔

”بهرام اور گل اندام“ کا مأخذ بهرام گور کے فارسی قصص ہیں۔ ”بهرام اور حسن بانو“ جو اس سے چند سال پہلے کی تصنیف ہے، اندازِ بیان بسیط شاعرانہ توضیحات اور بیانات میں اس کی ٹھنڈی کونہیں پہنچ سکتی۔ طبعی کی ٹھنڈی غواصی اور ابن نشاطی کے دبستان کی ٹھنڈی جس میں اس طرز کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔

طبعی کا ایک معاصر فائز تھا جس نے ۱۹۵۲ء میں ”قصہ رضوان شاہ و روح افزا“ کے نام سے ایک ٹھنڈی لکھی تھی۔ ظاہری اعتبار سے یہ ابن نشاطی اور طبعی غیرہ کی ٹھنڈیوں کا چربہ ہے۔ لیکن اس میں وہ شاعرانہ بلند پروازی اور لطف گویا نیں ہے جو اس دبستان کی ٹھنڈیوں کی نیایاں خصوصیت ہے۔

غلام علی اس عہد کا ایک اور قابل ذکر شاعر ہے، جس نے مک محمد جائی کی ”پدر مادت“ کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ وہ بلند پایہ شاعر تو نہیں تھا، تاہم اس نے اپنی ٹھنڈی کو دلخیل اور ٹڑھنے کے قابل بنانے کی امکانی کوشش کی ہے۔

دکن میں مغلیہ عہد کی متصوفانہ منویاں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دکن کی تین ہر مغل شہنشاہوں کا ایک سیاسی
سلک بن گیا تھا۔ اکبر کے زمانے سے یہ مقصد کسی شہنشاہ کی نظر سے او جھل
نہیں ہوا۔ آخر اور زمگ ریب کے ہاتھوں اس مقصد کی تکمیل ہو گئی جس کے
سرانجام سے ان کے اسلاف قاصر ہے تھے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے ”اگر پدر
نہ تو اندلس پر تمام کند“۔

دکن جب مغلیہ حکومت کا ایک حصہ بنا گیا اور اس کے علم و ادب اور
سیاست کے مرکز ختم ہو گئے تو قدیم اردو ادب اور شاعری پر احتفاظ طاری
ہونے لگا مغل امراء اور غواص، اردو کو روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے تھے۔
لیکن ان کی علمی، ادبی اور درباری زبان فارسی تھی۔ فارسی کے مقابلے میں
اردو کو ادبی اغراض کے لئے استعمال کرنے کا خیال تک بھی ان کے ذہن
میں نہیں گزرا تھا۔ یوں تفریح طبع کی خاطر کچھ شاعری خوبی کہہ لیا کرتے تھے بہرہ تا

کی قدیم لسانی روایات کے لحاظ سے، شایدیاں کے لئے ایک فطری بات بھی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل حکمران دکن میں اردو شاعروں اور اشاعتاروں کی کچھ قدر نہیں کر سکتے تھے اس لئے اس ذوق میں تبدیلی واقع ہونے لگی۔ شاعروں کی قوم ایک لخت فنا تو نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ باقی رہی اور اس کے ساتھ زبان بھی۔ اور وہ اس طرح کہ شمالی ہند سے تعلقات زیادہ مستحکم ہو جانے کی وجہ سے اردو ادب اور شاعری کا ذوق جس کی ترقی دکن میں مسدود ہونے لگی تھی۔ شمالی ہند کے یاسی اور علمی مرکزوں تک پہنچا اور وہاں فروع پانے لگا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ زبان کر بہت سرعت کے ساتھ ترقی ہونے لگی۔ اس میں شگ نہیں کہ مغلوں کے حملوں کی وجہ سے، جنوب کے یاسی اور علمی مرکزوں پر یہ کیے بعد دیگرے تباہی نازل ہوتی رہی، لیکن گولکنڈہ کی تباہی سے پہلے تک یہ ہوتا رہا کہ گجرات کی تباہی کے بعد گجرات کے اکثر علماء اور شعراء بیجا پور چلے گئے۔ بیجا پور کی شکست کے بعد ان کے لئے گولکنڈہ کا ایک مرکز باتی رہ گیا تھا۔ جماں کچھ عالم، ادیب اور شاعر چلے آئے۔ جب یہ آخری مرکز بھی مسدود ہو گیا تو دکن کے شاعر منتشر ہونے لگے۔ چنانچہ کچھ آر کاٹ اور ولپور کی طرف چلے گئے اور کچھ اور نگ آباد اور برہان پور اور پھر وہاں سے دہلی چلے گئے۔ عبد الوالی عزیز اُن میں بہت اہمیت رکھتے

سلطان ابوالحسن کی معزولی کے وقت جو شاعر پا یہ تخت میں موجود تھے یا نشود نما پار ہے تھے ان پر اس جاں کا ہدایتہ کا عبرت ناک اثر ہوا۔ ان کے اسلام جو قطب نہ ہوں کی سرپرستی میں کئی سو سال سے امن و امان کی زندگی بسر کرتے آئے تھے اور بے فکری سے شعر و سخن کی خدمت میں صرف تھے وہ سب ان کی نظر کے سامنے رکھا۔ اپنے ایسے محسنوں کا جن کے سامنے عاطفت میں انہوں نے نشود نما پائی تھی اور جن کے دیع اثر، حکومت، جاہ و حشم پر ان کا سہارا رکھا یک سرگوں ہو جانا ان کے لئے عبرت انگیر واقعہ کھا۔ ان واقعات کے بعد وہ دنیا سے یہ سے ہو گئے اور اس کے مکر و بھات سے کنارہ کشی اختیار کر کے، اپنے آپ کو مذہب کے حوالے کر دیا متصوفانہ خیالات جو ما یوس قلوب کا ٹڑا سہارا ہیں ان کا سہارا بن گئے اور انہوں نے اپنے کمال فن کا بہترین حصہ انھیں چیزوں کے نذر کر دیا۔

چنانچہ اس قاطگو لکنڈہ اور مغلیہ دور کی ابتداء میں ہم کو بہت سے ایسے شاعر ملتے ہیں، جو انھیں موضوعات پر تصنیف و تالیف میں مشغول تھے۔ ان تمام سخن سنجوں کو ہم چار گرد ہوں پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک گردہ مرثیہ نگار شاعر کا ہے جو اہل بیت اہمار کے مصائب لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتا رہتا۔ دوسرا گردہ مذہبی موضوعات پر لکھنے والے شاعر کا ہے جن میں ولی دیلوڑی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ولیور مدرس کا ایک قصبہ ہے۔

دہلی کی تباہی کے بعد، جس طرح دہلی کے اہل کمال فیض آباد، لکھنؤ، رام پور اور حیدر آباد چلے گئے تھے، اسی طرح گوکنڈہ کی تباہی کے بعد کچھ شاعر جنوب کی طرف چلے گئے اور ولیور، سدھوٹ، کرنول، بڑا پیپے جہاں چند رسمیں انھیں سرپرستی کے لئے مل گئے۔ چنانچہ بارہویں صدی ہجری کی ابتداء میں تصنیف کئے ہوئے یا محفوظ کتابت کئے ہوئے کئی مخطوطے ایسے ملتے ہیں جو انھیں مقامات سے تعلق رکھتے ہیں۔

ولی ولیوری کی مشنوی "روضۃ الشہدار" بہت مشہور ہے۔ یہ عرصہ تک غلطی سے ولی اور نگ آبادی سے منسوب کی جاتی رہی۔ ملا حسین واعظ کا شفی کی وجہ "مجلس" ولی کا مأخذ ہے۔ مرثیہ بخار عام طور پر جو واقعات باندھتے ہیں ان کے مقابلہ میں "روضۃ الشہدار" میں کئی اور واقعات مثلاً آنحضرت کی وفات، حضرت فاطمہؓ کی وفات، حضرت علیؓ کی شہادت وغیرہ اضافہ ہیں۔

اصل فارسی نظم دس ابواب پر منقسم ہے، جن کو "مجالس" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ "روضۃ الشہدار" کئی دفعہ چھپ چکی ہے اور اس کے مخطوطے بھی عام طور پر دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کی ایک اور مشنوی "رتن پدم" کا بھی ذکر اپنے نگرے اپنے کٹلائگ میں کیا ہے۔ لیکن یہ اب دستیاب نہیں ہوتی۔

مذکوری موضوعات پر لکھنے والا دوسرا شاعر اشرف ہے جو حضرت علیؓ اور اہل بیت کا بڑا دلدادہ تھا۔ حضرت علیؓ کی جنگوں کے حالات اس نے

فارسی سے ترجمے کئے تھے جو "جنگ نامہ" کے نام سے موسم ہیں۔ اس کا مخطوطہ بُرش میوزیم میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس نے کئی مرثیے بھی لکھے تھے جن میں سے تیرہ اُنہرایونی درستی لاہوری کی ایک قلمی بیاض میں درج ہیں۔

اس عہد کی متصوفانہ شنویوں میں بحری کی "من گن" اور وجہی کی "بچھی با جھا" بہت مشہور اور مقبول شنویاں ہیں۔

بحری دراصل مفہافات بجا پور کے ایک تھبہ گوگی کے رہنے والے تھے۔ ان کا پورا نام قاضی محمود ہے اور بحری تخلص اور لقب دونوں ہیں۔ ان کے والد گوگی کے قاضی تھے اور قاضی دریا کے لقب سے مشہور تھے۔ بجا پور کے اسقاط کے بعد یہ گولکنڈہ جانے کے لئے نکلے۔ راستہ میں انھیں بڑی مشکلات سے روچار ہونا پڑا۔ کچھ فراقوں نے ان کا مال و اسباب لوٹ لیا اور اسباب کے ساتھ ان کی تصنیفات کے مسودے بھی ضائع ہو گئے۔ بہت سی تکلیفیں اٹھا کر گولکنڈہ پہنچے۔ یہاں بھی چین سے بیٹھنے نہ پائے تھے کہ وہی مرصیبت یہاں بھی نازل ہو گئی، اور ان کے سر پرست ختم ہو گئے۔

بحری کی شنوی "من گن" نہایت مقبول ہوئی۔ چنانچہ یہ کئی بار چھپی اور اس کے مخطوطے بھی کثیر تعداد میں دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کے مدنظر ۱۱۵ھ میں بحری نے خود اس کا فارسی نظم میں ترجمہ کیا تھا،

جو "عروس عرفان" کے نام سے موسوم ہے۔ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کی ایک بیاض میں ان کی چند فارسی تحریریں اور ایک اردو نظم "بنگ نامہ" کا بھی کچھ حصہ موجود ہے۔^{۱۲}

عشرتی، جس کا نام سید محمد خاں تھا ایک مقدس سادات خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے تقدس کے منظر اور نگ ریپ بھی اس کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ اس نے سلوک و معرفت پر متعدد مثنویاں لکھی تھیں، جن میں سے "چلت لگن"، "دیپ پنگ" مکمل دستیاب ہوتی ہیں۔ چند اور نامکمل مثنویوں کے پارے بھی اس کی تصنیفات سے ہیں۔

عشرتی پر گو شاعر تھا اور اپنے زمانے کے مستند اساتذہ میں شمار ہوتا تھا۔ بعض نقادوں نے اس کے کارناموں کو ابن نشاطی وغیرہ کے کارناموں کا مقابل بتایا ہے۔

ذیل میں عشرتی کی مثنوی "دیپ پنگ" کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ یہ حصہ تمہیدی ابواب سے متعلق ہے اور اس میں ملک ہندوستان کی تعریف کی گئی ہے:

عجب ساز ہے ہند کا سوزناک کہ کرتا ہے نغمے سوں جیون حال را کھ

۱۲۔ ملاحظہ ہر فصیلی فہرست اردو مخطوطات کلید جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) ص ۷۸

ہندوستان ہے دیوال بتاب اس میست کئی ہات سوں عاشقان بت پرست
 بردہ ہی برہمن بوجھا رہی ہر کیک تو ہے ہند میں بت پرستی ادیک
 بھر یا ہند میں ڈاٹ کر یوں جمال کہ تسوں سامنے زہدو تقویٰ محال
 جنگل سارا اس کا ہے جنت کے ناد بیاض اس کا دستا نین کا سواد
 کہر کیک نہماڑی سنے ماہ ہے یوسف ہر کنا یے پو، جاں چاہ ہے
 نمک روپ کی کھن ہے خنجر پوہات خنجر، ہور نمک بخجتے ہیں ایک سات
 مرد زن میں نیں پر دے کا مسلک بردہ کا سمد ہے کر کیاں تلک
 اہو کھوٹ لے حسن پر دیاں منے سکھنڈا ہو ملیا عشق مردیاں منے
 ایک جگہ وہ غواصی کے متعلق اپنے خیالات کا انہمار یوں کرتا ہے:
 غواصی اگر دیکھتا آج کوں موتی کے نمن جل میں ڈب لاج سوں
 مجھے جیب کی دھر صرف اب بنجھار دعا کے گھر مجہ پو کرتا نثار
 ایک خاص طرز کی شاعری، جس کو اس زمانے میں مقبرلیت حاصل ہوئی
 نیکم مذہبی اور نیم ادبی تھی۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ ٹھیک مذہبی موضرعات پر
 لکھنے کی بجائے، فقہ، عقائد وغیرہ کے مسائل کو نصوص کے پیرایہ میں بیان
 کیا جاتا تھا۔ اس طرز کے سب سے زیادہ مشہور مصنف محمد علی عاجز ہیں۔ عاجز
 کی ایک تنوی "قصہ ملکہ مصر" فقہ کے مسائل پر مبنی ہے۔ دوسری تنوی "قصہ
 لہ لفظیل کے لئے ملاحظہ ہو نہ رست اردو مخطوطات کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ ص ۲۵۔

فیروز شاہ" ہے جس کا مأخذ ایک فارسی قصہ ہے۔ یہ "گل بکاؤ لی" کے مشہور قصے سے بہت مشابہ ہے۔

"قصہ ملکہ مهر" کو اس قد مقبولیت حاصل ہوئی کہ بعد کے اکثر شاعروں نے اس میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے اس میں اپنا نام داخل کر دیا ہے۔ اس طرح کے دو مخطوطے کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں ملتے ہیں یہ۔ اس قصے کو پڑھ کر بعد میں ایک اور شاعر فتح نے "قصہ زلینیائے ثانی" کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی جس کے واقعات بالکل "قصہ ملکہ مهر" سے ملتے جلتے ہیں یہ۔

اس طرز کے لکھنے والوں میں ایک اور شاعر شیخ دار ضعیفی بھی کافی شہرت رکھتا ہے۔ اس کی ایک ضغیم مثنوی "ہدایت ہندی"، "حنفی عقاید کے بیان پر مثبل ہے۔ دوسری مثنوی جو مذکورہ بالاطرز میں ہے، بلا عنوان ہے۔ اس میں ایک عورت کا قصہ لکھا گیا ہے، جو آنحضرت کی محبت میں اپنے آپ کو جلا کر فنا کر دیتی ہے۔ اس کا مقصد عوام کے قلوب میں آنحضرت کی محبت پیدا کرنا ہے۔

ایک اور مشہور شاعر سید شاہ حسین ذوقی بھی، اسی عهد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے "سب رس" کے قصے کو "وصال العاشقین" کے نام سے مثنوی کا

جامعہ پہنایا تھا۔ ذریقی کی دوسری شنوی حضرت غوث اعظمؑ کی منقبت میں لکھی گئی ہے۔ ایک اور شنوی "ماں باپ نامہ" بچوں کے لئے ہے۔ یہ شاعر صاحب دریان بھی تھا۔

وجہی کی "سب رس" کا منظوم خلاصہ اس زمانے کے ایک اور شاعر مجری نے بھی کیا تھا۔ جس کا نام اس نے "گلشن حسن ودل" رکھا تھا۔ "نیہ درپن" اسی عہد کی ایک اور مشہور شنوی ہے جو غلطی سے عشرتی کے نام سے منسوب کر دی گئی ہے۔ یہ دراصل عشرتی کے فرزند ہنر کی تصنیف ہے اور "پھول بن" کے جواب میں کہی گئی ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۱۴۴ھ ہے۔ ذیل میں اس کا وہ حصہ نقل کیا جاتا ہے جو ابن نشاطی کی "پھول بن" سے متعلق ہے:

بنا یا پھول بن ابن نشاطی	مشہی باس اس کی سب کے تین خوش آئی
جواب اس کا جو یو ہے نیہ درپن	ہے سچ دو عشق کے آنکھوں کا انجن
یو دونوں کوں اگر کسی آنکھ میں لائے	تفادت کا جو کچھ ہے رمز سوپائے
اسے اس تے اگر ناپائے بہتر	برابر تو یقین جانے، نہ کمتر
ہوا تیار حس ب دیاں میں "پھلبن"	مصنف تسلیم کھیا، بھرت کے پوسن
اگیارا سر کوں کم تھے بیٹ پر چار	سن، بھری لے آیا جب یوڑ کہ بار
ٹیا مج نیہ درپن نے یو جھلکار	اگیارہ سر پوتھے چالیس پر چار

محبت کو جو ہے عارض نیک بخوبی درپن
 اسے ہے رونا یونیہ درپن
 ہوا جب کامل اس کا نظم ہر حال زمانے نے کیا مج بھوت خوش حال
 کہیا تاریخ یورخ منخ رخن کا یونو تحفہ مبارک لئی ہنسرا کا
 انفار مفان کا عزہ سو جس دن ہوا یونیہ درپن بدر اسی چھن
 اسی مہینے کی تھی جو عیسیٰ مسعود ملیا ابن نشاطی تائیں مقصد
 اسی ماہ مبارک یعنی کرتار مرے مقصد کے رکھ کوں دیا بار
 میر جعفر زمی، جو اپنی احتجاجی نظم کی بدولت مشہور ہو چکا ہے، اسی زمانے
 سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ شہزادہ کام بخش کی فوجوں کے ساتھ دکن آیا۔ اور یہاں
 کے شعراء کے ساتھ رہنے لئے کی وجہ سے اس کے دل میں بھی اردو میں
 شعر کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ بعض تذکرہ نویس اس کو شاعر نہیں سمجھتے۔ اس کی
 نظمیں "جوبن نامہ"، "اختلاف زماں"، مشہور ہیں۔ عالمگیر کی وفات پر اس
 نے ایک مرثیہ بھی لکھا تھا۔ اس زمانہ میں جعفر، ایک ایسا شاعر ہے جس
 نے مزاجیہ نظمیں لکھیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دکن کے شعرا کی ذہنی کیفیت
 اس پر طاری نہیں تھی۔ صرف ایک نظم میں وہ قتوطیت کی طرف مائل نظر آتا
 ہے، جو عالمگیر کی وفات پر لکھی گئی۔

اس عهد کے چند اور شاعر جن کا تعلق دکن سے نہیں ہے، محبوب عالم
 عرف شیخ جیون اور مولانا عبدالی ہیں۔ شیخ جیون سید میراں بھیک حشمتی صابری

(متوفی ۱۳۱۳ھ) کے مرید تھے۔ ان کی تصنیفات میں چار مثنویاں ہیں۔ جن کے نام "محشر نامہ"، "درد نامہ"، "خراب نامہ بیغمبر" و "دہیر نامہ بی بی فاطمہ" ہیں۔ ان مثنویوں کے مخطوطے عام طور پر دستیاب ہو جاتے ہیں۔

مولانا عبدالگی مثنوی "فقہ ہندی" یا فقہ ہندی بھی قدیم اردو کی مشہور تصنیف ہے۔ یہ ۱۴۰۷ھ میں مرتب ہوئی۔ اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ اکثر کتب خانوں میں اس کے مخطوطے دستیاب ہوتے ہیں یہ وہی اور نگ آبادی جو اس عہد کا آخری شاعر سمجھا جاتا ہے، حقیقت شهرت اور اثر کے اعتبار سے اس عہد اور ہر عہد کا عظیم المرتب شاعر ہے۔ اس نے محمد قلی کی خاص طرز کو نہ صرف زندہ کیا بلکہ اس کو اس قدر ترقی دی کہ وہ فارسی شاعری کا مذہبِ مقابل بن گئی۔ غزل کی گھلادٹ اور شیرینی کی وجہ سے اردو شاعری شمالی ہند کے شعراً اور عوام میں بے حد مقبول ہو گئی جواب یہک فارسی کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں شمالی ہند کے مشہور فارسی گو شعراً جیسے سراج الدین علی خاں آرزو، فائز وغیرہ اردو شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہی کے دیوان نے جس طرز کی شاعری کی بنیاد ڈالی تھی، وہ ڈیڑھ پونے دو سال تک اردو کے بڑے بڑے شاعروں کا لائجہ عمل

بنی رہی۔ اسی اثر کے مدنظر اکثر تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے اس کو اردو شاعری کا باوادا آدم قرار دیا۔ فی الحقیقت وہ متوسط عہد کی شاعری کا باوادا آدم کھلانے کا سخت حق ہے۔

وَکی کا تعلق قدیم شاعری کے مقابلہ میں متوسط عہد کی شاعری سے زیادہ استوار ہے۔ کیوں کہ وَکی کی ڈالی ہوئی طرز کی شاعری کا ارتقا مسلسل اور اس وقت تک برابر قائم ہے۔ گوئی مختلف زمانوں میں یہ مختلف پیاسی اور معاشرتی اثرات سے متاثر رہی لیکن اس کا بنیادی اصول ہمیشہ ایک رہا۔

پروفیسر شیرانی وَکی کے بارے میں رقمطراز، میں کہ "وَکی ۱۳۵ھ میں دہلی میں وارد ہوتے اور اسی عہد سے دہلی میں اردو غزل گوئی عام روایج پا گئی۔ ورنہ اس سے پیشتر شعراء کے لئے فارسی یا بھاشا کا میدان کھلا ہوا تھا۔ اردو میں غزل گوئی کی بنیاد اگرچہ وَکی کے عہد سے پہلے پڑھکی تھی، لیکن ہندوستان میں غزل کے ذوق کو پھیلانے اور عام کرنے کا سہرا وَکی ہی کے سر ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ وَکی نے جس طرز کی شاعری کو روشن کرایا وہ فارسی کی روایات میں نشوونما پائے ہوئے شعرا کی طبیعت اور روحانی کے عین مناسب تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کی تحریک بڑی سرعت کے ساتھ اس عہد کے تعلیم یافتہ طبقہ کے قلوب میں گھر کر کر گئی۔

کیوں کہ اس شاعری کا دار و مدار زیادہ تر فارسی جندهات پر تھا اور فارسی خواہ
گھر گھر میں موجود تھے؟

دہلی نے کوئی طویل مثنوی نہیں لکھی تھی، ان کی ایک مختصر مثنوی جو "مثنوی
در تعریف سوت" کے عنوان سے لکھی گئی تھی، دہلی فائزگی مثنوی "تعریف
بستان مکبود" اور آبرو اور حاتم کی مختصر مثنویوں کے لئے نمونہ بن گئی۔

دوسرا متوسط کی ابتدائی مشنویاں

قدیم اردو شاعری کا عہد گو یا بیجا پور اور گو لکنڈہ کے نئے کچھ
شاعروں اور ان کے تابعین پر ختم ہو جاتا ہے۔ قدیم طرز کا سب سے نمایاں
مسک مشنوی نگاری تھا۔ جس کا ذوق دلی اور نگ آبادی کے زمانے کے بعد
سے کم ہوتا گیا۔ متوسط عہد کی شاعری میں غزل اور لغزل غنائی اور عاشقانہ
طرز کی شاعری کو تمام و کمال مقبولیت حاصل رہی۔ اور عصر حاضر تک اردو
شعراء کا کم و بیش یہی مسک رہا۔ متوسط عہد میں محض مشنوی لکھنے والے شاعر
شاید ایک دو سے زیادہ نہیں دستیاب ہو سکیں گے اور اس کی ذمہ دار بڑی
حد تک خود دلی اور نگ آبادی کی شاعری تھی، جن کے یہاں کلاسیکی انداز کی کوئی
مشنوی نہیں ملتی۔

دلی نے اس میں نتک نہیں کہ قدیم شاعری کے ماحول میں نشوونما
پائی تھی۔ لیکن ان پر گزناگوں اثرات کام کر رہے تھے۔ ہر بڑے شاعر کی طرح

ان کی شاعرانہ قابلیت اور طبیعت کی اونچ اپنے زمانے سے مختلف تھی۔ وطن میں شعردارب کی کس پرسی اور فطرت کے ذوق تماشانے، انھیں نو عمری ہی میں، وطن کو اور وطن کے ساتھ اس کی شاعری کے ماحول کو خیر باد کرنے پر مجبور کیا۔ گجرات اور احمد آباد کے عالموں اور ادیبوں کے درمیان رہنے بسنے سے، انھوں نے فارسی زبان، فارسی کے اساتذہ سخن کا انداز اور خاص طور پر حافظ اثیر از کو اپنے نمونے کے طور پر پیش نظر کیا اور ان کی فکر شعری نے بھی رخ اختیار کر لیا۔

دیکی جب دہلی پہنچے تو یہاں مغلیہ سلطنت اور اس کے ساتھ فارسی کا ستارہ غروب ہوا تھا۔ یہاں کے فارسی گو شعرا نے جب ان کا کلام سنا تو انھیں ایسا معلوم ہوا کہ ”یہ شاعری ان کے دل کے قریب ہے،“ کیوں کہ اردو ان کی زبان تھی، گو مرکز گر نیزی کی خصوصیت کی وجہ سے اس کارنگ روپ کچھ بدل گیا تھا۔ اس زبان کی طرف ان کا اس وقت بھی مائل نہ ہونا خلاف فطرت ہوتا۔ یہی سبب تھا کہ تھوڑے عرصہ کے اندر اندر دہلی میں اردو شاعری کا ذوق روز افزون ہونے لگا۔

دیکی کی شاعرانہ فکر کا حاصل ان کی غزل ہے۔ ٹمنریاں انھوں نے بہت کم لکھیں۔ ان کے کلیات میں صرف دو ٹمنریاں ملتی ہیں، جو مختصر ہیں۔ ان میں سے ایک روحانی کیفیت کا مرقع ہے، دوسری شہرسرت کی تعریف ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی شنویاں دہلی کے ابتدائی دور کے سخن سنجوں کے لئے نمونہ بن گئیں۔ دہلی کی شنویاں بیانیہ نہیں بلکہ مرفقتوں کی شنویاں ہیں جن میں مخصوص مرفقتوں کی تصور کیشی کی گئی ہے۔ ان کی شنوی "در تعریف شهر سورت" بہت مقبول شنوی ہے۔ اس شنوی سے ایک اقتباس درج ذیل ہے :

عجب شہر اس میں ہے پر نور یک شہر بلاشک دہ ہے جگ میں مقصد دہ
اہے مشہور اس کا نام سورت کہ جاوے جس کے دیکھے سب کو درت
جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہ نور اچھو اس نور سوں ہر پشم بد دور
شہر جوں منتخب دلوان ہے سب سرج سُن آب اس کی جگ میں کانپا
کنارے اس کے اگ دریاۓ تیستی
شہر سوں ہے وہ ہم بازو ہمیشہ کہ آب خضر کی ہے اس میں تاثیر
عجب قلعہ ہے واں اگ باقرینہ
نژک قلعے کے بارہ گھاٹ ہے واں اے ببل پاگ بینی سوں نظر کر
کھلے ہیں ہر طرف رخسار کے گھل جو کئی دیکھا ہے ان کا باغ رخسار
ہر اگ دید میں وہ محمد دیدار

اسے سوت حقیقت کی نشانی کہ ہے معمور وہاں اہل معانی
 اگر دیکھے ہیں لوگوں شام و تہریخ
 کہ اس بھیتر کتے ایسے ہیں تجبار
 اُنیں آش پستاں کی ہے بستی
 فرنگی اس میں آتے ہیں کلم پوش
 وہاں ساکن اتے ہیں اہل مذہب
 اگر چہ سب ہیں وہ ابنائے آدم
 بھری ہے سیرت و صورت سوں سوت
 سبھا اندر کی ہے ہر اک قدم میں
 نہ کسی وقت سوں کھینچے شوخ آنچیں
 نظر بھر کر دکھوں ہر گلبدن کوں
 پڑا شیریں بچن سن ان کے بس جو
 شہر بھیتر جو آدے نہان کا دن
 ہر اک جانب دکھوں ہیں فوج درفعہ
 نین کی بیٹھ کشی پر تو اے پاک
 عبث باتاں ہے بس کر اے ولی تو
 متوسط دور کی ابتدائی ٹھنڈیاں اسی طرز کی، میں۔ مثلاً حاتم کی شنڈیاں

نہ دیکھا کوئی ایسا ملک زخمیز
 کرتاروں کو نہیں ان کے نزک بار
 مکھے نمود داں آتش پرستی
 عدد دھاں جنکی گنتی میں ہے بے ہوش
 کر گنتی میں نہ آؤں اہل مشرب
 دلے بیش میں رنگارنگ عالم
 ہر اک صورت ہے وہاں انمول مورت
 چھپیا اندر سمجھا کوئے عدم میں
 دہ مکھ کے باع کن دیوار آنچیں
 کہ ہے پردے سوں بے پردا ان کوں
 پھنسا اس شہر میں جا کر مگز ہو
 ہندو کی قوم کے اشناں کا دن
 تجلی کے سمندر کی الٹی موجود
 یہ طے کر سچ میں موجود خطرناک
 نہ کر مقصد سوں اپنے کا ہی تو

"حقہ" اور "قہوے" کی تعریف میں۔ آبڑ کی ثنوی "آرائش معشوق" اور خاص طور پر فائز کی ثنویاں "بیان میلہ بھتہ" اور خاص طور پر "تعریف نہان بلکن برد" جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، وہی کے انداز کی ثنوی ہے۔ شہر سوت میں تاپتی ندی پر جس طرح ہر صبح اشناں کرنے والوں کا میلہ لگا رہتا ہے، یہاں بھی لوگ اشناں کرنے کے لئے آتے ہیں۔ اس ثنوی کے چند شعر درج ذیل ہیں:

ندی پر نمایاں ہیں یہ میں بدن جیوں روپے کی تھالی میں ڈھلتے بدن
کھڑے گھاٹ پر ہیں سبی نہم بہ خجل ان کے مکھ سے سورج اور چندر
کرے دل کو پانی ہرا کہ ہندنی نظر پر تی پانی اور پر چند نی
مرے دل کو آتا ہے اس سے خدر کہ ان کو نہ لागے سورج کی نظر
نظارہ انماں کا کر دل صبح دشام مجھے رات دن ہے نکویاں سے کام
اس دور میں میر نے ثنوی کو بہت ترقی دی اور کمی ثنویاں لکھیں برقعوں
کو انھوں نے بسیط تر بنانے اور جزئیات پر زیادہ حاوی کرنے کی کوشش کی۔
قصوں کو بھی انھوں نے پھر شنوی کے ساتھ جوڑا۔ لیکن اس خصوصیت میں میر کی
کوششیں بہت ابتدائی نہیں کی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے قصوں
میں سادگی بیان زیادہ نمایاں اور فوق الفطرت عناصر کم ہیں۔ پھر بھی وہ
نصب العینیت اور رومانیت سے بالکل خالی نہیں ہیں، جو قدیم قصوں کا
لازم ہے۔ ان مختصر قصوں میں، مناظر اور مکالموں کی بھی کمی ہے۔

لیکن یہ اضافی نقطہ نظر ہے۔ بنفہ میر کی مثنویاں اردو میں آپ اپنی نظیر ہیں۔ ان کے معاصر سودا کی مثنویوں میں یہ لطف کبھی نہیں ہے۔ سودا کے فصوص میں قصہ پن کم اور مرقاوں (ڈسکرپشن) میں مشاہدے کے عمق کا فقدان ہے۔ ان کی صرف ایک مثنوی "زرگر پسرو شیشہ گر"، پڑھنے کے قابل ہے۔

دہلی کی تباہی سے پہلے، شالی ہند میں، طویل، بسیط اور کمل ادبی مثنویاں نہیں لکھی گئیں۔ صرف ایک مثنوی "خواب و خیال" ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس عمد میں لکھی ہوئی تمام مثنویوں سے زیادہ طویل ہے اور مرقع نگاری میں، اس کے بعض پارے بے مثل ہیں۔ اس کے اسلوب کی سادگی اور لطف زبان بھی قابل تعریف ہے۔ لیکن اس کے تناسب اور تکمیل میں نامایاں اقسام ہیں اور جیسا کہ پہلے اور اراق میں اشارہ کیا گیا ہے، وہ قصہ سے شروع ہوتی ہے اور تصوف پر ختم ہو جاتی ہے۔ سراپا کا مرقع اس کی جان ہے۔ بظاہر اس میں ایک قصہ بیان کیا گیا ہے لیکن سراپا کے مقابلے میں قصہ کی اہمیت کم اور اختتام مہم رہ جاتا ہے۔

دکن میں دلی کے بعد مختصر مرقاوں کی طرز کی مثنویاں بھی رائج ہو گئیں۔ لیکن قدیم طرز کی طویل قصہ دار مثنویاں بھی اسی شرح و سبسط کے ساتھ لکھی جاتی رہیں۔ پہلی قسم کی مثنویوں پر دلی کے جانشین سراج اور نگاہ آبادی کے سوا

بہت کم شاعروں نے طبع آزمائی کی۔ اور دوسری قسم کی ثنوی کو تو سراج نے کویا
دکن میں معراج کمال پر پہنچا دیا۔

مخترقہ ثنویاں، سراج نے کل سات لکھیں، لیکن ان کا رنگ خاص ہے
یہ سب کی سب متصروفانہ خیالات کی حامل ہیں اور عاشقانہ ثنویوں میں بھی تصور
کا رنگ غالب ہے۔ ان ثنویوں کا انداز بیان اثرخیز ہے۔ لیکن واقعیہ ہے
کہ مختصر ثنویوں کا لطف میر کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے۔

سراج کی طویل ثنوی "بستانِ خیال" دکن کی بہترین اور اردو
کی بلند پایہ ثنویوں میں سے ہے۔ اس کی غلطت کی بنیاد طوالت نہیں بلکہ شاعرانہ
کمالات ہیں۔ سراج کا اسلوب، جدید روزمرہ سے قریب تر اور میر اور سودا کے
اسلوب سے بہت کم مختلف ہے۔ اس ثنوی کا لطف مناظر کے مصورانہ بیانات
مرقون اور جذبات انسانی کی صحیح صورت گردی میں ہے۔ اگر روزمرہ کے
جزوی اختلاف کو وجہ امتیاز بنایا جا سکتا ہے تو "بستانِ خیال" کا
درجہ "سحرالبیان" کے بعد ہے۔ ورنہ اس کے بعض پارے "سحرالبیان" پر بھی
فوقیت رکھتے ہیں۔ مثال کے لئے ذیل کا اقتباس ملاحظہ کے قابل ہے:
ہر کیک سمت پانی کی نہروں کی سیر دہ نہروں میں پانی کی لہروں کی سیر
میں جب دیکھنا تھا دہ نہروں میں لہر زیادہ دو نہروں سے چڑھا تھا زہر
روں آب کے ہر طرف آبشار جدھر دیکھئے ہو رہی تھی بہار

طرب بخش سکھانا چنامور کا
 ہر کیک سرد پر عشق پیچے کی بیل
 جھوکی ڈالیاں بید محبتوں کی تھیں
 ہر اک خوض پانی سے لمبے زیستھا
 سمن ارغوان، زگر عبہری
 تھے منڈوے ہر اک قسم انگور کے
 درخت آنب کے سبز اور ساید دار
 ادھر بلبوں کی غزل خوانیاں
 ادھر سرور عناء کے سبزے کی دھوم
 ہزارا اناراں کے تختوں کی سیر
 پٹ جھوم آیا تھا ابر بھار
 عجب وقت تھا اور عجب زنگ تھا
 ہر کیک قسم کا میوہ خوش مذاق
 مجھے دیکھنا تبغ تھا اس طرف
 ”بوتان خیال“ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ قدیم شنویوں کے
 تفصیلی بیانات اور جزئیات کے مرقعوں اور جدید شنوی کی حقیقت اور تکمیل
 کا بہترین مجموعہ ہے۔

گذشتہ دور کے وفا شعاعر پیر و اس زمانہ میں نوازش علی خاں شیدائتھے۔ جنھوں نے دو طویل شعریاں لکھیں "روضۃ الامار" اور "اعجاز احمدی" یہ دونوں طویل شعریاں قدیم مددھبی اثر کی یادگار ہیں۔

ایک اور قابل ذکر مثنوی "قصہ لعل دگوہر" ہے جو عارف الدین خاں عاجز کی لکھی ہوتی ہے۔ یہ غواصی اور ابن نشاٹی کے دبتان کی مثنوی ہے۔ جس کے واقعات، افراد اور بیانات سب فرضی اور نصب العینی ہیں۔ لیکن اس کا اسلوب لطف سے خالی نہیں ہے۔ اسی لئے معاصرین اس سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ شاہ غلام قادر سامی جو اسی زمانے میں بارے سے آکر اور نگ آباد میں مقیم ہو گئے تھے، اس مثنوی سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس کے جواب میں خود ایک طویل مثنوی "قصہ سرد شمشاد" لکھی تھی۔ شاہ سامی کے معاصر اور رفیق لالہ بھی نارائن شفیق نے "جمستان شعرا" میں اس کی ہدایتی تعریف لکھی ہے اور اس کے طویل اقتباسات نقل کئے ہیں۔ جو پڑھنے کے قابل ہیں۔ یہ مثنوی اب غالباً نایاب ہے۔ سامی کی ایک اور مثنوی "طالب و مونہی" کا ذکر بھی شفیق نے اپنے تندکہ میں کیا ہے جواب عام طور پر دستیاب نہیں ہوتی۔ "طالب و مونہی" کے عنوان کی جو مثنوی انڈیا افس کے کتب خانہ میں موجود ہے، اس کے مصنف میر سید محمد والہ ہیں۔

یہاں سے پہلے کی تصنیف ہے۔ والہ حیدر آباد کے رہنے والے تھے،

لیکن نور الدین خاں والا جاہ سے توسل کے بب وہ اركات پلے گئے تھے۔
اس میں شک نہیں کہ ولی کے اثر سے، اس وقت دکن میں غزل کا
کافی رواج ہو چکا تھا، تاہم مشنویاں بھی برابر اور مسلسل لکھی جاتی رہیں۔ اکثر
شاعر جن کا ذکر اس دور کے تذکرہ وں میں ملتا ہے، نہ صرف غزل بلکہ مشنویاں
اور خاص کر طویل مشنویاں بھی لکھتے تھے۔ لیکن ابھی ان میں سے اکثر مشنویاں گوئے
گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں۔

عبدالولی عزلت، جودی کے "شہر پر نور" کے رہنے والے تھے، اور
دہلی میں بھی ان کا قیام رہا، جہاں میر تقی میر سے ان کی ملاقاتیں رہیں اور
قدیم شعرا کے بارے میں میر نے اپنے تذکرہ کے لئے ان کی بیاض سے مواد حاصل
کیا تھا، صاحبِ دیوان تھے۔ اس کے علاوہ تین مشنویاں بھی انہوں نے لکھی
تھیں۔ ایک "بارہ ماسہ" جوان کے دیوان میں شامل ہے، دوسرا "ساقی نامہ"
اور تیسرا مشنوی جو "رَأْگِ مَالا" کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں مسیقی کے
چھراؤں اور راگینیوں کی تشریح ٹری خوبی سے کی ہے۔ یہ بارہ سو اشعار
پر مشتمل ہے۔ ہر راگنی اور پتھر کی تفصیل کی جو تصویر دہ کھینچتے ہیں ٹری پر لطف ہے۔
ذیل میں پتھر آندہ کی تصویر ملاحظہ ہو:

عجائِب ایک تھا رنگیں نہیں کہ اوس کے صحن میں پھولاتھا گلشن
پکھا تھا اس میں فرش زعفرانی کہ اوس کا حاشیہ تھا ارغوانی

بجا تا بانسری دہاں اک جوان تھا کہ جاہ حسن سے دہ کامراں لئا
 کنار اس کے تھی بیٹھی ایک پیاری کہ اس کی نے نوازی کی تھی ماری
 لئے تھی بیڑہ پان تانیا وے دہ دل تھا چاہے دلب کو دکھلائے
 پری رو دو تھیں آگے نغمہ پرداز ہر اک کے ہاتھ میں باجے تھا اک ساز
 بجا میں ایک کرتی نغمہ سازی کرے تھی دوسری مندل نوازی
 پرندہ سن کے لاگا سیس دھنے اتکر اندر آیا راگ سننے
 جوان کے دل میں سودا کی لگی ہول سرود غیر و اپنا بھی گیا بھول
 سماء سے مگن ہو مرد دلبند بنا کر دل سے گایا پستہ آندہ
 اس دور کو ختم کرنے سے پہلے دکن کی ایک نہایت دلچسپ ثنوی کا ذکر
 ضروری ہے۔ یہ لالہ بھی ناراین شفیق کی تصنیف ”تصویر جاناں“ ہے شفیق
 اور نگ آباد کے متوفی اور مولانا میر غلام علی آزاد کے شاگرد رشید تھے۔
 اور نگ آباد میں قدیم اور جدید معاورہ کا سنگم ہوا تھا۔ اس طرح ان کی زبان
 پر شماری ہند کے معاورے کافی اثر تھا۔ اس کے علاوہ یہ ثنوی ایک
 طبع زاد اور نہایت ایکی قصے مشتمل ہے اور اس قابل ہے کہ اردو کی اعلیٰ پایا
 ثنویوں میں اس کو جگہ دی جاتے۔ اس میں کمی صرف مناظر اور مرقعوں کی
 ہے جو ”بوستانِ خیال“ اور ”سمیر البيان“ کی جان ہیں۔ یہ ثنوی اب چھپ
 چکی ہے۔

گوکنڈہ کے شعرا، کے متعلق، مشرقی دکن، مدراس وغیرہ کی طرف منتشر ہو جانے کا ذکر اور پگذر چکا ہے جماں دیلوار، سدھوت، کرنول وغیرہ میں چند امار جن میں سے بعض قدیم سلطنت گوکنڈہ کے متسل رہ چکے تھے، ان کی قدر دانی کرنے کے لئے موجود تھے۔ ان شعرا کے اثر سے کئی اچھے اپنے شاعر اس نواح میں بھی پیدا ہوتے، جن میں ہمارے موجودہ مقصد کے بخت، مولانا محمد باقر آغاہ دیلواری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ بڑے پر گوشادر اور انشا پرداز تھے۔ ایک دیوان کے علاوہ، جس کا دیباچہ انہوں نے اردو نثر میں لکھا ہے کئی منوریاں یادگار جھوڑی میں جو مدرسی اور متصوفانہ موضوعات پر مشتمل ہیں۔ یہ منوریاں حسب ذیل ہیں : "ریاض الجنان"؛ "ہشت بہشت"؛ "محبرب القلوب"؛ "منوری رد پ سنگار"؛ "گلزار عشق"؛ "قصہ رضوان شاہ" وغیرہ۔ آغاہ منوری کو قدیم اساتذہ کے اصول پر لکھتے تھے۔

دہلی میں جب اردو شاعری کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کے تھوڑے عرصے کے اندر اندر اس کا اثر دور دور تک پھیل گیا۔ چنانچہ پنجاب میں بھی کئی اچھے اپنے شاعر پیدا ہونے لگے جنہوں نے دہستان دہلی کے اتباع میں قدیم پنجابی شاعری کا نفع بدلتا شروع کیا۔ غزل، ترجمیع بند، شنوی، غرض اکثر مقبول اصناف میں یہاں نظمیں لکھی جانے لگیں۔ منوری کی حد تک صرف دو شاعروں کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ ان میں سے ایک حضرت

غلام قادر شاہ ہیں جن کی دفاتر ﷺ میں ہوئی۔ یہ بڑے صاحب باطن بزرگ تھے۔ ان کے حالات اور ان کی شنوی "رمزالعاشقین" کا ذکر پروفیسر محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں مفصل کہا ہے۔ شنوی کے متعلق وہ مطرانہ ہیں "اس شنوی کا وزن عروضی فالص ہندی ہے۔ پنجابی لمحے کی تمام خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ یہ درحقیقت دہلی کے جدید اسکول سے بہت کم تاثر ہے اور قدیم مذہبی اردو شاعری کی آخری یادگاروں میں سے ہے۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے جو "پنجاب میں اردو" سے مأخوذه ہے۔

سات مراتب بوجھہ پیارے ہر ہر کے میں روپ نیارے
 ست گرسوں توں کہ تحقیق نا ہو ملحد نا زندین
 فرق ارجمع موس فرق بچھان پھر دونوں کوں ایک ہی جان
 بوجھہ یتو تسریہ کو خوب نا ہو ملحد نا محبوب
 بھی تشبیہ کوں جانوں نیک پھر دونوں کوں جانوں ایک
 ظاہر موس ہے وحدت کثرت باطن موس ہے کثرت وحدت
 قدم وجوب کے سبہ اسماء جانوں فاعل فی الائشیار
 از لی ابدی ہیں درکار نا نہ معطل نا بے کار
 اس مشهد موس ہے ہے مسجد و المقصود
 یوں ہے سب اسماء کیانی حادث جانوں اور نقصانی

اس منظر میں را کھے ساجد فو الطالب وہ الاعد
 بندے کا ہے طاعت کام "واعبد ربک" سنوں کلام
 کرو عبادت دن اور رات شرک اور رشک ہوں ہوئے نجات
 کرو عبادت شرع آمین حسکوں ناہیں شرع گواہ
 جس کوں حاصل ہوئے نورِ یقین حق نے کہیا نورِ مبین
 جس کوں حاصل ناں یہ نور طبع ہوا کا ہے مغادر
 ناں ہو اس کو قرب وصال شرع بنائے ہے قرب محال
 دوسرے بزرگ حضرت مراد شاہ ہیں جو لاہور کے رہنے والے تھے۔
 لکھنور کا سفر بھی کیا تھا اس لئے ان کے اسلوب پر دہان کے اساتذہ کا اثر
 کافی ہے۔ یہ صاحبِ دیوان ہیں۔ اپنے ایک شاگرد کے کھنے سے انھوں نے
 نفسہ چهار درویش کو نظم کا جامہ پہنانا شروع کیا تھا لیکن اس کی تکمیل نہ
 کر سکے۔ ۱۲۱۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

دہلی کے اساتذہ مثلاً میر اور سوداگی طرز میں وہ ثنوی خوب لکھتے تھے
 اور جیسا کہ پر دنیسر حافظ محمد شیرانی نے لکھا ہے "ان کی طبیعت غزل
 سے بہتر ثنوی پر محبتی ہے۔ ثنوی میں وہ کسی سے پچھے نہیں اور اہل ہندوستان
 کے دروش بد روشن ہیں"۔

ذیل میں ان کی ایک دلچسپ شنوی "مگس نامہ" کا کچھ حصہ "پنجاب میں اردو" سے اخذ کر کے نقل کیا جاتا ہے۔ اپنے وطن لاہور کی تعریف میں وہ لکھتے ہیں :

کیا بھار اس کی کردن تحریر
گلعتداروں چسن کی تھی بھار
کو چنیتے تھے دکھا کے رخ دل کو
خوب رو تھے حیا سے سبھوف

شہرتھا یا مرقع تصویر
گل تھے ہر ایک کے گئے کاہار
خانہ خانہ میں تھے کمال ابرد
رشاک آبادی جہاں تھا یہ

الغرض خوب ہی مکاں تھا یہ
سو زمانے نے ایسی زشتی کی
لے کے دوزخ میں ڈال دی کیبار
زرو شاہ زماں سدھاڑے

مکھیوں کی غرض دہائی ہے
لے کے دوزخ میں ڈال دی کیبار
ذوہ رونق نہ وہ صفائی ہے
اب ہیں پر مکھیوں سے سب لاچار

مکھیوں کو گئے اجارہ دے
نهیں آرام ان سے رات اور دن
ہیں یہ گردن پہ آہ سب کی سوار
دن کر کیا کہتے بات کھانے کی

و قتا رہنا عذاب النار
اٹش جو ع نے جگر کو کباب
مکھیوں کی غرض دہائی ہے
خشک روٹی کھیں پکاتا ہے

مکھیوں کی غرض دہائی ہے
کھانے کے دل کوں کیا ہو سو بیتاب
مکھیوں کو گئے اجارہ دے
کس مھیبت سے وہ بھی کھاتا ہے

اور قلیہ پلاو کھائے گون ہو کے کس سے اور پکائے گون
پک کئی شب کمیں جو تھوڑی دال اس کے کھانے کا کیا لکھوں حوال
ماش کا دیکھے زیج میں چھلکا کھا کے دسواس وہ جو تھا دل کا
منہ سے لفتمہ دہیں اُگل ڈالا دیکھیو دال میں ہے کچھ کالا
یا یہ کھتے تھے کیا ہوا، ہے ہے لا یہو طشت مجھ کو آتی ہے
فیقر اللہ آزاد ایک اور بزرگ ہیں جن کی ایک مشنوی "درستون" ۲۰۵^{۱۲}
کی تصنیف ہے۔ اس کی بھرہندی ہے اور اس کو پڑھنے سے شاہ برهان الدین
جانم کی مشنویوں کی یادِ ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔
رحمت شاہ جو اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں مشنوی "شیریں فرہاد"
کے مصنف ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر نو دس شعر کے بعد ایک
دہا آ جاتا ہے۔ پروفیسر شیرانی نے زبان کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ بھاشا اور
پنجابی آمیز ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ کبھی پنجابی غالب ہے اور کبھی برجم"

شنوی اپنے عروج پر

جب دہلی اجڑنے لگی تو دہلی کے اکثر علماء اور شعراً اور وہ کے حکمرانوں کی سرپرستی میں پناہ لینے کے لئے ترک دشمن کے فیض آباد اور لکھنؤ میں آ کر بس گئے۔ تھوڑے عرصہ کے اندر اندر لکھنؤ میں شعر و سخن کی ایسی گرم بازاری ہوئی کہ یہ خطہ رشک دہلی بن گیا۔ یہاں اتنے اچھے اچھے شاعر جمع ہو گئے اور نشوونما پائے کہ یہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا اردو مرکز بن گیا۔ اردو شاعری کے ساتھ جدید عصر کی شنویوں کا ارتقاء بھی یہیں ہوا لکھنؤ میں شنریاں دہلی کے دور کے مقابلے میں بہت لکھی گئیں لیکن ان کا شعری پایہ بہت بلند ہے۔ قدیم بسیط اردو شنویوں کے نمونے، نہ دہلی کے شعراً کے پیش نظر تھے، نہ لکھنؤ کے شعراً ان سے پوری طرح واقف تھے۔ اس طرح لکھنؤ کی ترقی یافہ شنریاں قدیم شنویوں سے بہت کم متاثر ہو سکیں۔ تاہم ایک محکم جوان کے درمیان مشترک تھا، وہ فارسی شنوی کے

نمونے ہیں۔ اسی لئے لکھنؤ کی شنویوں کا ارتقائی بھی کم و بیش قدیم شنویوں کی طرز پر ہوا۔ یہاں بھی شنوی اور فاص طور پر بلند پایہ شنویاں قصتوں ہی کے لئے استعمال کی گئیں۔

لکھنؤ کے ابتدائی شنوی نگاروں کے سامنے، دہلی کے اس اڈہ کے نمونے تھے بلکہ ان میں سے اکثر شاعر ایسے تھے جو دہلی سے آتے تھے۔ اس لئے چند شنویاں جیسے میر سوز اور قیام الدین قائم وغیرہ کی جو ابتداء میں لکھی گئیں وہ بالکل دہلی کی طرز کی تھیں۔ قائم نے اس میں شک نہیں کہ ایک قدم آگے بڑھایا تھا۔ چنانچہ ان کی شنویاں مکمل اور کسی قدر سبیط قصوں پر مشتمل ہیں۔ مصححی جیسا استاد فن ان کی شنویوں کی تعریف کرتا ہے۔ تاہم یہ اعلیٰ درجہ کی شنویوں میں شمار نہیں ہوتیں۔ اسی طرح میر قمر الدین خاں منت کی شنویاں یا خواجہ میر درد کے شاگردہ دہدایت اللہ خاں ہدایت کی شنوی شهر بنارس کی تعریف میں اچھی شنویاں ہیں۔ لیکن ان کی انفرادی خوبیاں ایسی نہیں کہ انھیں بلند پایہ شنویوں میں جگہ دی جائے۔ ان میں سے اکثر کم و بیش طویل نظمیں ہیں۔ اسی لئے یہ شنویاں ان کی غزل کے مقابلہ میں کچھ زیادہ چمک نہ سکیں۔

اس عہد کے آغاز میں ایک اچھی شنوی میرزا علی لطف نے لکھی تھی جو "نیرنگ عشق" کے نام سے موسم ہے۔ مصححی اور جرأت کی شنویوں

کے مقابلہ میں کسی تدریج، ہے، اور اس کی زبان میر کی شنویوں کی زبان کی طرح سادہ اور سلیس ہے۔ اس میں ایک شاہ صاحب کا قصہ منظوم کیا گیا ہے، جو ایک دلہن کے حسن پر جس کا محافہ ان کے نگیوں کے قریب کچھ دیر کے لئے رکا تھا، ایسے فدا ہو جاتے ہیں کہ جب محافہ روانہ ہو جاتا ہے تو جان بحق ہو جاتے ہیں۔ اس کی خبر جب لڑکی کو ملتی ہے وہ شاہ صاحب کی قبر پر آکر جان دے دیتی ہے۔

متوسط دور میں ثنوی کامیابار لکھنؤ میں دراصل میر حسن کی شنوی "سحرالبیان" کے لکھے جانے کے بعد بلند ہوا۔ حسن الفاق سے یہ ثنوی لکھنؤ کے ادبی ارتقا کے ابتدائی زمانے میں لکھی گئی اور اسی لئے بعد کے شنوی بخاروں کے سامنے ایک بلند معیار قائم ہو گیا۔ اس معیار تک پہنچنے کی اکثریون نے سعی کی، لیکن وہاں تک نہ پہنچ کے۔

اس میں شک نہیں کہ "سحرالبیان"، طوالت اور بیط مرتعوں کے اعتبار سے قدیم عہد کی مشہور شنویوں کو نہیں پہنچ سکتی۔ تاہم یہ متوسط طول لے اعلیٰ پایہ ادبی کارنامہ کی حیثیت سے اردو میں اپنا نظر نہیں رکھتی۔ اگلی اور پہلی تمام شنویوں کے مقابلے میں اس کی چند ممتاز خصوصیات ہیں جس کے سب وہ اس صنف کی سب سے بہتر پیداوار محبی جاتی ہے۔

بلے نظیر اور بد رمیر کی داستانِ عشق اپنے فوق الفطرت عنابر اور

نصب العینی ماحول کے باوجود حیات انسانی کی اصلی اور بنیادی صدائوں اور فطرت انسانی کی غیر متغیر حقیقتوں سے معور ہے۔ وہ ایک مسلسل تھے ہے اور عمدہ فن کاری کا نمونہ کر دا نگاری میں بھی میرحسن نے ایک قدم آگئے ٹھہرا یا تھا، جو پہلا اور منظم تصویں کی حد تک آخری قدم بھی تھا۔ میرحسن نے بخوبی انسان کا جو نسوانی کر دا رکھا یا ہے وہ نظر انسانی کی بنیادیں پر قائم ہے۔ میرحسن کے جذبات نگاری کے مرتعے اور عمیق مشاہدات، مناظر اور بیاناتِ نہایت واضح اور پرکیف ہیں۔ سب سے بڑھ کر ان کی زبان کی لطافتِ سادگی اور شیرینی ہے جہاں یہ دونوں خصوصیات شامل ہو جائیں، ایک بلند پایہ ننی کارنامے کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ میرحسن کے مکالے دہلی کے شنوی نگاروں کے مقابلے میں زیادہ بسیط اور قدیم شنوی نگاروں کے مقابلے میں موجودہ روزمرہ کے زیادہ قریب ہیں۔ اس لئے ان کے کارنامے کا لطف لازدال ہو گیا ہے۔ "سحرالبیان" اسی حد تک نصب العینی ہے کہ اس میں ایک خیالی دنیا پیش کی گئی ہے لیکن یہ خیالی دنیا، دراصل جن اجزاء سے تعمیر ہوئی ہے، وہ میرحسن کے اطراف کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے "سحرالبیان" صرف ایک نصب العینی دنیا کا تھا، ہی نہیں بلکہ ان کے زمانے کی معاشرتی حالت مذاق اور طرز زندگی کا ایسا یہ مرقع ہے۔

یہی وہ امور ہیں جن کی وجہ سے میرحسن کی مثنوی کو ادبی کارناموں میں بلند تر ہجھ دی جاتی ہے۔ اس مثنوی کا اثر معاصرین پر اور بعد کے شعرا پر یہ ہوا کہ کھنوں کے اکثر شعرا نے مثنوی کو شاعری کی اصناف میں فاس طور پر داخل کر لیا اور اس پر طبع آزمائی کرنے لگے۔ لیکن جیسا کہ واقعات سے ظاہر ہے "سحرالبیان" کے رتبہ تک بہت کم مثنوی نگاروں کے کارنامے پہنچ سکے۔

میرحسن نے دو اور مثنویاں "رموزالعارفین" اور "گلزار ام" بھی لکھی تھیں، لیکن اب وہ صرف تاریخِ ادب کی زینت ہیں۔

میرحسن ہی کے زمانے کے ایک قادر الکلام شاعر، مرزا محمد لقی خاں ہوں نے "یسلی مجنون" کو نظم کا جامہ پہنایا۔ لیکن ان کی مثنوی کو بہت کم شہرت حاصل ہوئی۔ کیوں کہ "یسلی مجنون" کی داستان اردو والوں کے لئے سئی نہیں تھی۔ پھر میرحسن کا انداز بیان بھی ہوں کے لبس کی بات نہ تھی۔ وہ بکلف اور تضع کی طرف زیادہ مائل تھے۔ ان کی شاعری کی اس خصوصیت نے "یسلی مجنون" کو بہت زیادہ چکنے نہ دیا۔

ہوں میرحسن کے دبتان کے شاعر ہیں تھے۔ لیکن جرأت اور مصطفیٰ دونوں جو میرحسن ہی کی سی روافی اور سلاست زبان اور لطف گویاں پر فی الجملہ دسترس رکھتے تھے، دراصل غزل کے اساتذہ تھے اس لئے جب

وہ شنوی لکھنے بیٹھے تو ایک شنوی کو بھی "سحرالبیان" کے درجہ تک نہ پہنچا سکے۔ مصطفیٰ کی شنوی "بحرالمحبت" کا قصہ میر کی شنوی "دریائے عشق" سے ماخوذ ہے۔ اس قصے کو یعنی کا مقصد ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور پچھے نہیں ہو سکتا کہ اس کو بڑھا چڑھا کر "سحرالبیان" کے درجہ تک پہنچایا جائے۔ لیکن وہ اپنی تمام کوشش اور موثرگاریوں کے باوجود میر تک بھی نہ پہنچ سکے۔

مستعمل موضوع میں ہمیشہ یہ خرابی ہوتی ہے کہ نقش ثانی جب تک نقش اول سے بلند پایا نہ ہو، قابلِ اعتنا نہیں رہتا۔ یہی "بحرالمحبت" کے ساتھ بھی ہوا۔ جس خیال کو میر نے سادھے سیدھے انداز میں پیش کیا تھا اسے مصطفیٰ نے معنوی ساختاً بنایا۔ مثالاً ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں:

ایک جا اک جوان رعنائھا	لالہ رخسار سرو بالا تھا	میر
ایک جا اک جوان خوش ظاہر	تھا نیٹ فن عشق سے ماہر	مصطفیٰ
ہوش جامارہا نگاہ کے ساتھ	صبر خصت ہوا اک آہ کے ساتھ	میر
صبر بھاگا بدیدہ گریاں	ناشکیبی سے بندھ گیا پیمان	مصطفیٰ

مصطفیٰ نے اگر کوئی نیا قصہ انتخاب کیا ہوتا یا کم از کم میر جیسے بلند پایا صناع سے مواد نہ لیا ہوتا، تو ان کی شنوی طبعزاد ہونے کی وجہ سے ایک مقام پیدا کر لیتی۔

جرأت نے کئی مشنویاں لکھیں اور غالباً میر حسن پر فوقيت لے جانے کے خیال سے انہوں نے بھی آثر اور میر جسیے استاد انِ فن کو اپنا مطلع نظر بنا یا۔ چنانچہ ان کی اکثر مشنویاں مختصر اور مخفی کیفیات یا مناظر کے مرقعے ہیں۔ صرف دو مشنویاں طویل ہیں۔ ایک "کارستانِ الفت" اور دوسری خواجہ حسن کے عشق کی داستان جو "حسن و عشق" کے نام سے موسم ہے۔ یہ مشنوی زیادہ اہم ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا قصہ طبعزادہ ہے اور غالباً اس کے اکثر جزئیات حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس میں فوق الفطرت عناء صریحی نہیں ہیں اور اس کا اخلاقی بہیلوہ بھی نہایت موثر ہے لیکن اسلوب بیان میں نہ میر کی سی سادگی ہے اور نہ میر حسن کی سی سادہ پر کاری۔ وہ میر کی طرح قصے پر زیادہ نظر رکھتے ہیں اس لئے میر حسن کے سے مرقعے اس میں نہیں پیدا ہو سکے۔

سعادت یا رغاف زنگیں نہایت جذبت پسند شاعر تھے۔ لیکن ان کی نکر کی فرادانی اور جذبت کے حد سے بڑھے ہوئے شوق نے ان کی مشنویوں کو حسن خیال اور لطف گفتار کا نمونہ بننے نہ دیا۔ کہنے کو تو انہوں نے کئی مشنویاں لکھیں لیکن ان میں سے ایک بھی اعلیٰ پایہ کی نہیں ہے۔ وہ لطف جو قصہ بیکار مشنوی گو اپنی مشنویوں میں پیدا کر سکتے ہیں اس سے بھی یہ اس وجہ سے محروم رہے کہ انہوں نے راقعات پر مشتمل مشنویاں لکھی ہیں چنانچہ ان کی

شنسیوں کو پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر سے زیادہ واقعات لکھنا چاہتے ہیں۔

غرض اس عہد کے شنسی نگاروں کی اس کثیر تعداد میں سے کسی کا کارنامہ لاژوال ادبی ثہرت کا مالک نہ بن سکا۔

آتش کے شاگرد پنڈت دیاشنکر نیسم کے ہاتھ میں شنسی نے ایک نیا جون بدلا نیسم کے زمانے تک لکھنؤ کی سوسائٹی پر شاعرانہ نزاکت پسندی اس قدر غالب آگئی تھی کہ پڑھنے لگئے لوگ ایک طرف رہے، عوام بھی جو لے چال میں شاعرانہ صنعتوں کو ملحوظ رکھنا لازمہ علم مجلس سمجھتے تھے نیسم جو اپنے عہد کی حقیقی پیداوار تھے، صناعی کا ایک اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اس لئے جب انھوں نے "گلزار نیسم" لکھی تو اس کو مشرق کی مخصوص صناع ذہنیت کا ایک یادگار نمونہ بنادیا۔ میر حسن کے بعد، لکھنؤ کی یہ دوسری بلند پایہ شنسی نے، جس کو اردو کے غیر فانی کارناموں میں جگہ مل سکتی ہے۔

"گلزار نیسم" کا قصہ ہندوستان کا ایک مشہور تھا ہے۔ لیکن نیسم نے اسے اپنے اسلوب کی ندرت کی وجہ سے زندہ کر دیا ہے۔ چنانچہ بعد کے کئی قصہ نگاروں کے لئے نیسم ہی کا کارنامہ نمونہ بننا۔ اس شنسی کی سب سے نمایاں خوبی اس کا صنعت گرانہ انداز بیان ہے جس میں چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بغیر کسی لطف کے التزام کے نہیں کہی جاتی۔ اس کے استواروں

اوہ شبیہوں کی ندرت، محاوروں اور صنعتوں کا لطف، ایجاد اور شعریت اسی کے ساتھ مخصوص ہو گئے ہیں۔ اس اسلوب کی مثنوی دوسری نہیں ملتی۔ یہ حقیقت میں حسن کاری کا ایک خاص انداز ہے۔ لکھنؤ کے آخری آیام کے شانستہ ترین مذاق کی یہ ادبی یادگار بھی "سحرالبیان" کے دوش بد دش زندہ رہے گی۔

"گلزار نیسم" کا قصہ نہایت دلچسپ ہے اور اس کا اخلاقی پہلو بھی بلند ہے۔ "سحرالبیان" کی طرح اس میں بھی انسانی نفیات، فطرت اور جذبات کے نفیس مرقعے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ لیکن "گلزار نیسم"، جزئیات میں بھی زیادہ نصب العینیت کو محفوظ رکھتی ہے۔ اس کے مقابلے میں "سحرالبیان" کے منفرد اجزاء، حیات کے زیادہ قریب ہیں۔

"سحرالبیان" ہی کی طرح "گلزار نیسم" بھی بعد کے مثنوی مگاروں کے لئے ایک معیار بن گئی۔ اکثر وہ نے اس کی تقلید کی کوشش کی لیکن اس میں کامیابی بہت کم لوگوں کو ہوئی۔ شرمنے اس زمانے کی ایک مثنوی کا ذکر اپنی تصنیف "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" میں کیا ہے جو آغا علی شمس نے "گلزار نیسم" کے جواب کے طور پر لکھی تھی اور اس کی بڑی تعریف کی ہے لیکن یہ مثنوی اب دستیاب نہیں ہوتی۔

"گلزار نیسم" کے بعد اس کی تقلید، جواب یا اس کے اثر کے تحت

جتنی شنویاں لکھی گئیں ان میں آفتاب الدوّلہ قلق کی مشنوی "طلسم الفت" نہایت اہم اور قابل ذکر ہے۔ "تاریخ شنویات اردو" کے مصنف نے لکھا ہے کہ اہل لکھنواں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ لیکن وہ خود مسٹر ام باپوکسینہ کے ہم خیال ہیں، اور اس میں کئی سقلم نکالتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ مشنوی قصے، اسلوب بیان اور شعری خوبیوں کی وجہ سے اس زمانے کی اکثر شنویوں پر نوقیت رکھتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قلق نے عام طور پر شاعرانہ موشگانیوں سے بہت کام لیا ہے۔ لیکن یہ زیادہ تر وہ ہوتا ہے جہاں وہ جزئی تفصیلات اور تشریحات سے لطف پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں قصے کے تسلیل کا انھیں خیال رہتا ہے، وہ سادہ سیدھا اسلوب بھی اختیار کرتے ہیں۔ مؤلف "شہر المند" کی رائے اس کے متعلق زیادہ صحیحی تملی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مشنوی "طلسم الفت" "گلزار نیسم" اور "بدر منیر" کا مجموعہ ہے۔ اس میں "گلزار نیسم" کی طرح خیال بندی رعایت لفظی اور تشییہ واستعارے کا التزام کیا گیا ہے اور "بدر منیر" کی طرح ہر قسم کے مناظر نہایت تفصیل کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔ چیزیں مجموعی یہ "گلزار نیسم" کے دبستان کی مشنوی ہے لیکن چونکہ مصنف پنڈت نیسم کا اضاع ذہن نہیں رکھتا تھا اس لئے اس کو گلزار نیسم کے ربہ تک نہ پہنچا سکا۔ اس میں

۱۵۸
له تاریخ شنویات اردو از مولوی حافظ جلال الدین احمد جعفری، زبانی مطبوعہ انوار احمدی ال آباد

مکلفات کے علاوہ قصتے کے اقسام بھی موجود ہیں، تاہم، اس دبستان کی مثنویوں میں "گنزاریم" کے بعد سب سے زیادہ پڑھنے کے قابل یہی مثنوی ہے۔ نواب واجد علی شاہ اختر بھی کئی مثنویوں کے مصنف ہیں لیکن ان کی ایک مثنوی "حزن اختر" کے سوا کسی میں کوئی خاص بات نہیں۔ مثنوی "غزالہ دماہ پیکر" اور مثنوی "دریائے عشق" جن میں قصتے بیان کئے گئے ہیں، بہت معنوی رتبہ رکھتی ہیں۔ "دریائے عشق" پھر بھی کچھ دلچسپ ہے، کیون کہ اس میں میر حسن کے دبستان کی پیروی کی گئی ہے۔ اس کا قصہ کمل ہے لیکن شاعرانہ خوبیوں سے عاری۔ "حزن اختر" ان کی اپنی داستان غم ہے اس لئے اس میں اثر پیدا ہو گیا ہے۔ واجد علی شاہ کی بلکہ نواب پادشاہ مل جو عالم تخلص کرتی تھیں۔ ایک اچھی مثنوی کی مصنف تھیں جو "مثنوی عالم" کے نام سے موسوم ہے۔

لکھنؤ کے آخری زمانے کے مثنوی نگاروں میں، نواب مرزا شوق سب سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ اور یہ گویا خصوصی مثنوی نگار ہیں۔ اسی لئے انہوں نے اپنی تمام توجہ اسی صفت پر صرف کی۔ اس کے مقابلے میں، دوسرے مثنوی نگار دراصل غزل گو تھے اور اتمام محنت کے طور پر مثنوی پر بھی طبع آزمائی کر لیا کرتے تھے۔

شوقي کی مثنویوں کا اصلی محکم دراصل معاورات نسوان کا تحفظ تھا۔

چنانچہ "بھار عشق" کے خاتمہ پر انہوں نے اس کا انہمار سمجھی کہ دیا ہے۔ اور یہ چیز شنوی کے لئے ایک انوکھی حدت تھی، اس لئے ان کی شنویاں بہت مقبول ہوئیں اور شوق کی شہرت عام ہو گئی۔

ان کی تین شنویاں "بھار عشق"، "زہر عشق" اور "فریب عشق" برت مشہور ہوئیں۔ پہلی دو شنویاں خاص رجسٹر کرھتی ہیں۔ ان کے قصے دلپسپ ہیں اور ان میں جذبات انسانی کی صورت کشی کی گئی ہے۔ ان تصویں میں فوق الفطرت عناصر نہیں ہیں۔ اس لئے ان کے افراد زندہ اور پہلتے پھرتے انسانوں سے مشاہدہ معلوم ہوتے ہیں۔ "زہر عشق" سب سے زیادہ موثر اور حزنیہ شنوی ہے۔ اس کی ہیر و سُن مہ جبین کے غم میں ہم اپنے آگے ایک شفیقی انسان کے رنج دغم کی طرح شرکیپ پاتے ہیں۔

مکالے شرق کی شنویوں کے بہترین اجزاء ہیں۔ ان میں روزمرہ اور نیادرہ کا پورا لطف موجود ہے۔ اگر شوق پر اپنے زمانے کے مذاق کا تردید سب نہ ہوتا تو وہ یقیناً ایک بڑے صنایع ثابت ہوتے۔ بھالہت موجودہ شوق کی ششویاں واجد علی شاہ کے زمانے کے تعیش پسند لکھنؤ کے دنیا شوار نہش نہدم ہوتے۔

شویں کے قصے تیر کی طرح خلاف قیاس ضرور ہیں، لیکن ان میں فوق الفطرت میں افسر کا نہ ہونا ان کو اگھے تمام تصویں پر امتیاز عطا کرتا ہے۔ یہ

قصہ دار مثنوی کے فن میں حقیقت کی طرف پہلا قدم تھا۔ لیکن یہی آخری قدم بھی ثابت ہوا، کیونکہ ہمارے شاعر اور انشاء پرداز، اپنی زندگی تنہا بسر کرنے کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ ایک پردوسرے کا اثر مشکل سے پڑ سکتا ہے۔ شوق کے قصتوں میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ ان میں تنوع نہیں ہے۔ انجام سے قطع نظر، جزئیات میں تمام مثنویاں ایک جسمی معلوم ہوتی ہیں۔ اور یہی حال کرداروں کا بھی ہے۔ صرف "زہر عشق" کی ہیرون میں کسی قدر انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ تناسب جو حسن کاری کی جان ہے، ان مٹنوں میں مفقود ہے۔ ہیرون کی گفتگو کو بے ضرورت طورانی بنادیا گیا ہے، ان تمام امور کے باوجود شوق کی مثنویاں خاص طور پر "زہر عشق" اردو ادب میں زندہ رہے گی۔

مذکورہ بالخصوصی اور مشہور مثنوی نگاروں کے علاوہ لکھنؤ کے عروج کے زمانے میں اور بھی کئی مثنویاں لکھی گئیں۔ ناسخ جو دربتان لکھنؤ کے اولین اساتذہ میں سے ہیں، ایک مثنوی "نظم سراج" کے مصنف بھی تھے۔ ان کی ایک اور مثنوی میلاد اور مناقب میں ہے۔ لیکن ان کا ذکر صرف ایک بڑے شاعر کی تصنیف ہونے کے تعلق سے کیا جاسکتا ہے۔ مثنوی ناسخ کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ گو "نظم سراج" میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے کچھ نقوش مل جاتے ہیں۔ مرا جہدی حسن خاں آباد کے ہاں بھی ایک مختصر مثنوی ملتی

ہے۔ لیکن ان کے داسوخت کی ثہرت بھی اس شنوی کو حاصل نہ ہو سکی۔ مزرا عالم علی بیگ تھر کو شنوی سے خاص لگاؤ کیا اس لئے انھوں نے کئی شنویاں لکھیں اور ان میں بعض شنویاں خاص طور پر مشہور ہوئیں اور ٹپھنے کے قابل بھی ہیں۔ ان میں "شنوی داع غنگار"، "داع دل مہر" اور "شنوی شعاع مہر" قابل ذکر ہیں۔

سید اسماعیل حسین منیر نے تین دیوانوں کے ساتھ ایک شنوی "معراج المفہوم" ائمہ معصومین کے کشف و کرامات پر لکھی ہے۔

شیخ امام بخش نائج سے مشہور شاگرد میر وزیر علی صبانے جو غزل گوئی کے بڑے دلدادہ تھے۔ میر اور سودا کے شکار ناموں کی طرز کی ایک شنوی "شکار نامہ و اجد علی شاہ" لکھی تھی۔ لیکن اس میں سودا کے شکار ناموں کا شکوہ ہے اور نہ میر کے شکار ناموں کے سے مناطر اور مرقعے۔ اس لئے یہ شنوی ان کے کلام میں صرف اھناف کے تنوع کی یادگار کے طور پر رہ گئی ہے۔

تیرہویں صدی کے نصف اول میں جب دہلی میں اردو شاعری کو دوبارہ فروغ حاصل ہوا اور مومن، ذوق، غالب، شیفتہ اور داع جیسے باکمال شوار پیدا ہوتے تو غزل اپنے عروج کو پہنچ گئی لیکن شنوی بھاری کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ ذوق جن کے اسلوب کو شنوی سے منابت تھی، اس طرف توجہ نہ کر سکے۔ غالب کے دیوان میں صرف ایک

"ثنوی" در صفت انہ، ملتی ہے، جو غالب کے حسن گفتار کا پورا لطف رکھتی ہے لیکن یہ بہت مختصر ہے۔ صرف مومن نے کئی ثنویاں لکھیں اور ان کو محنت اور توجہ سے سرانجام کیا لیکن یہ مختصر ثنویاں ہیں اور جو کسی قدر طویل ہیں، پائچھے چھ سو شعر کے درمیان ہیں۔ ان میں بظاہر چند قصے بھی ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کی سب قلبی داردات اور کیفیات کے نقشے ہیں۔ وہ ایک شاعر کا دل اور ساحر کی زبان رکھتے تھے۔ اور جیسا کہ مشہور ہے، عشق و محبت کے راز دنیا ز سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ اس لئے ان کی ثنویاں غیر معمولی اثر رکھتی ہیں۔ اس وصف میں شاید نواب مرا شوق کی حزینیہ ثنویاں ان کی مد مقابل کھلا سکتی ہیں۔ ان سب پر مستزاد مومن کی زبان اور اس کا لطف ہے۔ ثنوی میں وہ سادہ بیانی کی کوشش کرتے ہیں لیکن خیال آفرینی اور لفظی صناعی جو ان کی غزل کا مخصوص وصف ہے، اس سے یہ قطعاً نہیں بچ سکتے تھے۔ تاہم سادگی جو ثنویات کا لازم ہے، اس کی رعایت نے ان کے خاص انداز میں ایک اچھا اعتدال اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ان تمام امور کے باوجود یہ ثنویاں کوئی غیر معمولی ثہرت اس لئے حاصل نہ کر سکیں کہ میرسن کے بعد سے ثنوی کا جو معیار اردو خوانوں کے ذہن میں قائم ہو گیا تھا ان پر یہ پوری نہیں اترتیں۔ یہ محض بیانیہ ثنویاں ہیں یا خاص کیفیات کے مرقعے، بسیط، طویل اور بلند یا یہ ثنویوں کی گوناگونی اور قصے کے اعتبار

سے خاکہ کی دلچسپی ان میں موجود نہیں ہے۔ لیکن یہ فیض ادبی پارے، میں اور فاصل طور پر ان لوگوں کے لئے جو مومن کی بدیع الاسلامی سے گھرا تے ہیں، دلچسپ مطالعہ کا کافی موارد رکھتے ہیں۔

امیر کی ثنویاں "نورِ تجلیٰ" اور "ابرِ کرم" بھی نظر انداز نہیں کی جاتیں کیوں کہ امیر نے اپنی ثنویوں کو خاصی محنت اور توجہ سے سرانجام کیا ہے۔ ثنویوں میں امیر نے مذہبی عقائد اور روایات یا مناجات میں نظم کی ہیں اور نہایت سلاست اور روانی کے ساتھ جوان کی فکر کا خاصہ ہے۔ زبان کے لحاظ سے یہ دلچسپ ہیں، لیکن ان کے موضوع ادبی اعتبار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

داع نے صرف ایک ثنوی "فریادِ داع"، لکھی تھی، جو نہایت دلچسپ ہے۔ اس میں حسن و عشق کی دار داتیں بیان کی ہیں۔ زبان میں سلاست کے باوجود، شعری لذتیں موجود ہیں لیکن صرف ایک ثنوی کسی شاعر کے انداز کا تصفیہ کرنے کے لئے بہت ناکافی موارد ہے۔ "فریادِ داع" سے اس قدر ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اگر داع اس طرف خاص توجہ کرتے تو یقیناً عمدہ ثنویاں سرانجام کر سکتے تھے۔

عبد متوسط کے آخری شعرا میں اچھے ثنوی نگار، مشی امیر اشہ تسلیم اور محسن کا کوروی ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی ثنویاں اپنے مخصوص اور انفرادی

نگ کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ تسلیم نے کئی متنویاں لکھیں جن کے نام
حسب ذیل ہیں :

(۱) دل و جان (۲) نامہ تسلیم (۳) صبح خندان (۴) نغمہ مسلسل (۵) ثبوت
شاہ جہانی (۶) سفرنامہ نواب رام پور۔

ان میں قصے بھی ہیں، سوانح اور تاریخیں بھی۔ "نامہ تسلیم" میں محور
غزنوی کے قصے کو نظم کیا ہے۔ "شوقت شاہ جہانی" تاریخی متنوی ہے اور
نواب رام پور کا سفرنامہ سوانح کی چیزیں رکھتا ہے۔ زبان میں روانی بھی ہے
اور سادگی بھی لیکن یہ واقعہ ہے کہ رہ لکھنؤ کے آخری شعراء کے تخلفات بارہ
سے زیادہ متاثر تھے۔ اسی لئے ان کی متنویاں کافی طویل ہونے کے باوجود وجہ ذہبی
اور مرقعنوں سے عاری ہیں۔ ان میں زیادہ تر دلائل ہیں جو نظم میں بیان
کئے گئے ہیں۔ ان میں کہیں کہیں شاعری کا لطف بھی پیدا ہو گیا ہے یہ دراصل
تسلیم کی پرگوئی کا سبق ہے۔

محسن کا کوردی متفقی اور مذہبی آدمی تھے۔ ان پر مذہب کا اثر گھرا تھا
اور دل پر شعیریت غالب تھی۔ اس لئے ان کی متنویاں مذہبی موضوعات پر
مشتمل ہیں اور اسلوب شاعرانہ ہے۔ مذہبی موضوعات پر لکھنے والوں میں محسن
غالباً سب سے زیادہ نمایاں شاعر ہیں۔ ان کا اسلوب دلکش اور پر لطف ہے۔ اس
میں سادگی کے باوجود حسن اور شاعرانہ لطافتیں موجود ہیں۔ ان متنویوں کے

بعض پاہے اتنے دلچسپ ہیں کہ زبانِ زدِ عام ہو گئے ہیں۔ اس خاص انداز میں حسن کو گویا خصوصی مرتبہ حاصل ہو گیا ہے۔ مذہبی نظموں میں لطف گویا یعنی کم شاعروں کے حصے میں آیا ہو گا۔ ان کی مشہور مثنویاں ”چراغِ کعبہ“، ”صحیح تبلی“، ”نگارستانِ الفت“، ”فغانِ محسن“ ہیں۔

پہلی مثنوی میں معراج کا واقعہ نظم کیا گیا ہے۔ ”صحیح تبلی“ آنحضرت کی ولادت سے متعلق ہے۔ اور یہ دونوں محسن کے شاہ کار ہیں۔ ان میں تغزل کے استعاروں اور کنایوں سے بڑا لطف پیدا کیا گیا ہے۔ یہ سب مثنویاں مختصر اور نفیس اربی نظیں ہیں۔

مشی طوطا رام شایان کی مثنوی ”ترجمہ مہا بھارت“ اپنے موضوع کے لفاظ سے اردو مثنویوں میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ شایان خوش فکر شاعر بھی تھے، اور اپنی ساری شاعرانہ صلاحیتوں کو انہوں نے اپنی مثنوی میں صرف کیا ہے۔

مشوی جدید دورہ میں

اردو ادب اور شاعری کا جدید دور، ہندوستان پر انگریزوں کے
سلط کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی ابتداء رنسویں صدی کے اوائل
سے ہوتی۔ برطانوی سیاسی سلط اور انگریزی تعلیم کی تردی کے ہندوستان
کی زندگی، طرز معاشرت اور اس کے ساتھ ساتھ ادب اور شاعری میں بھی
نمایاں تغیر پایا ہونے لگا۔ اردو شاعر اور انشاء پرداز، مغلیہ حکومت اور اس کے
متول امیروں اور رئیسوں کی سرپرستی میں، جو تجھیلی زندگی بسر کر رہے تھے،
اس کے لئے اس نئے دور میں گناہ نہیں تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی
ناکامی نے بیرونی باماریوں کے نلاف ہندوستانیوں کی جدد جد کا عرصہ
کے لئے خاتمه کر دیا۔ اب اردو شاعریوں اور انشاء پردازوں کی قدمیم ذہنی اور
رومان خیز زندگی کا کوئی تدریج نہیں رہا تھا اور وہ حقائق سے بہرہ آزمائی
ہونے پر مجبور تھے۔ فطرتاً ان کا قدمیم ہزار خیال آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔

اس تبدیلی کا اثر مثنوی کی صفت پر انقلاب انگیز ثابت ہوا۔ اس میں اسلوب اور ظاہری ساری تبدیلوں کے ساتھ ساتھ اہم معنوی تبدیلی بھی رونما ہونے لگی۔ اس تبدیلی میں بڑا حصہ اس دور کے چند نایاں سخن پڑا فیض کا ہے جن میں آزاد اور خاص طور پر حائی قابل ذکر ہیں۔ آزاد نے اردو شاعری میں اصلاح کی داع بیل ڈالنے کے لئے "انجمن پنجاب" کے نام سے جو ادارہ قائم کیا تھا، اس کی مساعی کے لئے مثنوی نے سب سے پہلے سانچے فراہم کئے۔ خود آزاد نے اس انجمن کی سرپستی میں جو مثنویاں لکھی تھیں ان کے اثر سے اد رس ب سے بڑھ کر حائی کی محبتدانہ کوششوں سے اردو مثنوی کی مقبولیت اور افادت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

آزاد نے جو مثنویاں لکھی تھیں اس میں شک نہیں کہ وہ قدیم مثنویوں سے مختلف موضوعات پر ہیں اور ان کا مقصد بھی معین اور ہماری روزمرہ کی زندگی سے قریب تر ہے۔ تاہم ان کے اسلوب میں قدیم استعاروں، کنایوں کے ساتھ ساتھ فیالی نزاكتوں کو بھی غاطر خواہ جگہ دی گئی تھی۔ اس لئے آزاد کی مثنویاں "سوکم زمستان"، "شبِ قدر" اور "ابِ کرم" دیغیرہ حقائق اور روایت دنوں سے ملبوہ ہو گئی ہیں۔

اس کے برعخلاف خالی کی مثنویاں "بر کھارت"، "شکوہ ہمند"، "چپ کی داد" دیغیرہ حقائق اور منظاہر فیضت کا عکس ہیں۔ ان میں زندگی

کے کئی رخ نہایت سادھے سیدھے اسلوب میں پیش کر دیے گئے ہیں۔ اتحاد موصوعات اور ان کو پیش کرنے کے طریقے دونوں میں حآلی نے سادگی اور صداقت کو ملحوظ رکھا ہے اسی لئے ان کی مشنویاں بالکل نئی چیز ثابت ہوئیں۔ اور جلد جاذب توجہ بن گئیں۔ یہ مشنویاں تعداد میں تھوڑی اور مختصر سی، لیکن ان کی وجہ سے، جدید شاعری میں قومی خذبات، احساسات اور مقامی رنگ کی ابتدا ہوئی۔ حآلی کے مرقعِ حقیقی ہندوستانی زندگی کے نقشے معلوم ہوتے ہیں۔ حآلی سے پہلے اردو شاعری حقیقی مرفعوں کو بھی ایک نسب العینی یا استوار کے انداز میں ظاہر کرنے کے عادی تھے، اور اسی کروہ شاعری تصور کرتے تھے لیکن حآلی نے نہایت جرأت کے ساتھ قدم آگے بڑھایا اور اس طسل سم کو توڑ دیا۔ کو اس میں انھیں پہلے پہل اعتراضوں کا مورد بنتا پڑا۔

حآلی نے جدید مشنوی کے نہ صرف نونے پیش کرنے پر اکتفا کیا بلکہ اس صفت کی خدمت اس سے زیادہ انجام دی۔ انھوں نے اپنی معرکۃ الاراقنیف "مقدمہ شعر دشاعری" میں مشنوی کی اہمیت، اس کے امکانات اور اس کی اصلاح کی ضرورت پر کافی بحث کی ہے اور اس طرح جدید مشنوی کے لئے اردو ادب میں اصولی طور پر ایک بلند جگہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں :

"مشنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور سکھا رہ آمد"

صنف ہے۔ جتنی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں ہیں ...

ان میں کوئی صنف مسلسل مضمایں کے بیان کرنے کے قابل

شنوی سے بہتر نہیں ہے۔ یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے

فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دی جا سکتی ہے؛

جدید شاعری کے اولین نمونے پیش کرنے کے لئے حاجی نے صنف

شنوی کا جوان تناب کیا وہ ایک اتفاقی چیز نہیں تھی بلکہ اردو شاعری کی تمام

اصناف میں اس صنف کی سب سے زیادہ ترقی پرور اور سب سے زیادہ ووت

اور ہمہ گیری رکھنے والی صنف ہونے کا اعتراف تھا۔ اور اس کو منتخب کر کے

حاجی نے اس کو ثابت کر دیا۔ اس کے نفیس نمونے پیش کر کے گویا انہوں نے

اپنے زمانے کے شاعر دن پر واضح کر دیا کہ روزمرہ زندگی کے حقائق، الگ

صدقیت اور ہوشیاری کے ساتھ سادھی سیدھی زبان میں پیش کئے جائیں

تو شعریت اور اثر ان میں خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں حاجی نے زبان کی ترقی کو کبھی ایک صحت بخش راستہ

پر ڈالنے کی کوشش کی چنانچہ انہوں نے قدیم شعرا کے موٹے موٹے عربی

اور فارسی لغات اور ترکیبیوں کے بجائے، اپنی نظموں کے لئے ایسی زبان

اختیار کی جو نہایت سلیس، روشن ہندی اور فارسی کے مناسب الفاظ

اور ترکیبیوں سے مالا مال تھی۔ انھیں اپنی نظموں کے ہندوستانی کے

عنوان نجويز کرنے میں بھی لطف آتا تھا۔ کیوں کہ یہ عام بول چال کی زبان تھی۔ غرض حآلی نے ہر طرح اس بات کی کوشش کی کہ ہماری حیات اور شاعری میں جو بعد سا پیدا ہو رہا تھا اس کو حتی الامکان گھٹا دیں اور اس میں انھیں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔

حآلی کے زمانے میں کئی شاعر ایسے پیدا ہو گئے تھے جو ان کے اصول کے پیرو اور ان کے ہم نوا تھے۔ ان میں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی سب سے پیش پیش ہیں۔ حآلی کے اصول پر انھیں اتنا اعتقاد تھا کہ اس کے اظہار کے لئے انہوں نے ایک قصیدہ لکھا جس میں قدیم طرز شاعری پر حآلی سے زیادہ شدودہ کے ساتھ اعتراضات کئے ہیں۔ یہ قصیدہ ان کی کلیات میں شامل ہے۔

اسماعیل نے جدید نظمیں لکھنے کی مشق انگریزی شاعری کے ترجموں سے شروع کی لیکن جلد ہی وہ ایک معین راستہ پر پڑ گئے۔ محکمہ تعلیمات کی ملازمت او زبجوں کے لئے درسی کتابوں کی ضرورت نے انھیں ریڈریں لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ ان ریڈروں کے لئے ان کے پاس نظمیں مہیا نہیں تھیں۔ اس لئے خود انہوں نے حصوں پر حصوں نے نظمیں لکھنی شروع کیں اور رفتہ رفتہ اس میں انھیں خصوصیت حاصل ہو گئی۔

اسماعیل نے درس دیندریں کے سلسلہ میں بچوں او زبجوں کے ساتھ

انسانی نفس کے مشاہدے اور معلومات کا جو ذخیرہ فراہم کیا تھا اس کو انہوں نے اپنی نظموں میں پورے طور پر کام میں لانے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ نظمیں بچوں اور بڑوں، سب کے لئے یکساں دلچسپی کا سامان رکھتی ہیں۔ ان کے موضوع اور طرزِ ادا، ہر چیز نہایت سادہ اور موثر ہے۔ ان نظموں میں اکثر ثنویات ہیں۔ مثلاً "خدائی تعریف"، "اسلام کی بیلی"، "ہوا چلی"، "برسات کا موسم"، "ہماری گائے" وغیرہ یہ موضوع اور ان کے اسالیب ہم سے اس قدر قریب ہیں کہ ان کے پڑھنے میں ایک خاص لطف آتا ہے۔

حالی کی طرح اسماعیل کے ہاتھوں میں ثنوی زیادہ تر مرقع نگاری یا ڈسکرٹپری شاعری تک محدود رہی، لیکن اس کے بعد ہی، ایسے سخن پر داز منظر عام پر آنے لگے جنہوں نے اس صنف کو زندگی کے اعلیٰ تر مسائل فلسفیا اور بنیانیہ موضوعات سے بھی روشناس کرایا۔

اکبر الہ آبادی کی شہرت کی ابتداء اس میں شک نہیں کہ ایک ثنوی سے ہوئی۔ لیکن حقیقت میں ثنوی کی صفت میں ان کا کوئی قابل قدر کارنامہ نہیں ہے۔ غزل سے اکبر کو تمام و گمال دلچسپی تھی اور اسی میں انہوں نے ہر طرح کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

شووق قدوالی کسی قدر بعد کے زمانے کے ان شعرا میں سے، میں

جنہوں نے متنوی پر خاص توجہ صرف کی اور کافی سرمایہ اس صنف میں جھوٹ گئے۔ ان کی متنویوں کے حالی کی طرح کے متعلقوں سے لے کر سائنس، مذہب، حسن وغیرہ جیسے علمی اور فلسفیانہ مسائل پر بھی حاوی ہیں۔ متعلقوں کی نظریوں میں وہ جزئیات پر حالی سے زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں اور ان کے اسالیب میں جدت طرازی اور لفظی صناعی زیادہ ہوتی ہے۔ اس طرح کی نظریوں میں "بہار" اور "ہندوستان کی برسات" پڑھنے کے قابل ہیں۔

"حسن" پر شوق نے ایک طویل متنوی لکھی ہے جس میں انہوں نے کائنات کے اکثر اجزاء میں باہر سے حسن ٹوٹانے کی کوشش کی ہے۔ پوری نظم حسن کی تعریف، اس کے بجزیئے اور اس کے منظاہر کے نفیس نفیس بیانات پر حاوی ہے۔ ان دلچسپ اور فلسفیانہ مباحثت سے ہٹ کر مطہیٹ علمی موضوعات پر ان کی نظم "سائنس اینڈ ریلی جین"، اردو میں اپنی طرز کا واحد کارنامہ ہے۔ اس میں گویا سرید کے اتباع میں شاعر نے سائنس اور مذہب کی ظاہری مفارقت دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم کا ابتدائی شعر ہے ۔

تمہ آخر سینس کو مذہب کا شہمن کیوں سمجھتے ہو
غلط فہمی سے نادرانی کے کانٹوں میں الجھتے ہو
آگے سائنس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرلتے ہیں ۔

جماعتیا ہے وہ ایمان کو خلاق ہستی پر
 جھکا دیتا ہے وہ انسان کو نیز دل پرستی پر
 یہ مسائل بنظاہر نہایت خشک اور غیر شاعرانہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن شوق نے
 جس عمدگی سے ان پر اظہار خیال کیا ہے، وہ پڑھنے اور لطف اندوز ہونے
 کے قابل چیز ہے۔

شوq نے منوی کو پھر قصے سے وابستہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ
 انھوں نے گلزار نیم کی طرز کی ایک طویل منوی "ترانہ شوق" لکھی تھی۔ جس
 کا اسلوب گلزار نیم سے مشابہ ہے۔ لیکن اس میں دیسی لفظی صناعی نہیں ہے۔
 قصے کے اعتبار سے یہ بھی پیدہ اور ناقص ہے اور فرق الفطرت عناد مرکی اس
 میں کمی نہیں ہے۔

شوq کا قابل قدر کارنامہ ان کی مشہور نظم "عالم خیال" ہے۔ یہ ہندی
 شاعری کا پرتو معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا اصول بالکل ہندی شاعری
 سے ماخوذ ہے۔ اور اس کی زبان میں شوق نے فارسی اضافتوں سے احتراز
 کی بھی کوشش کی ہے۔ یہ نظم دراصل "بارة مار" کی طرز کی ہے۔ اس میں
 ایک فراق زدہ عورت، شوہر کی جدائی میں جو کیفیتیں اس پر بتتی ہیں ان کو
 بیان کرتی ہے نظم نہایت موثر ہے اور اس میں جگہ جگہ نسوانی نفسیات کے
 گھرے مطابع کا ثبوت ملتا ہے۔

شوق کے معاصرین میں علامہ علی حیدر طباطبائی، نواب حیدر یار جنگ نظم، اپنے علم و فضل کی وجہ سے نہایت عزت اور احترام رکھتے تھے۔ باوجود اپنی تمام جدّوں کے وہ شعر کو قدم روایات اور معیار کا پا بند رکھنا چاہئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جو مُنزوی "ساقی نامہ شِقشیقیہ" لکھی تھی۔ اس میں معانی، مطلب اور اسالیب کے اعتبار سے جن بند علمی معیار کو برقرار رکھا گیا ہے، اس کے سبب یہ مُنزوی، ان کی دوسری نظموں مثلاً "شام غریبیاں" وغیرہ کے مقابلے میں زیادہ مقبول نہ ہو سکی۔ یہ مُنزوی شراب کی براہیوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس ضمن میں شاعر نے عصر جدید کے ان گمراہ نمونوں کی خوب مذمت کی ہے جو مے نوشی کو ترقی کی ضمانت سمجھتے ہیں۔

اس وقت تک عام اردو شاعری میں کافی وعدت پیدا ہو چکی تھی۔ نئے نئے طرز خیال اور دبستان کے شاعر پیدا ہونے لگے تھے۔ قدیم بندشوں سے خلاصی پا کر اردو شاعری حقیقی ہندوستانی زندگی کے تمام مسائل پر حادی ہوتی جا رہی تھی۔ انھیں میں ہندو عقائد، روایات، مدرہیں اور فلسفہ بھی شامل ہیں۔ قدیم طرز کی شاعری میں ان کے لئے گنجائش بھی موجود تھی۔ خود ہندو شعراً شاعری کے عام روحانات سے اس قدر متاثر تھے کہ ان سے تجاوز کرنے کا خیال ان کے دل میں بہت کم پیدا ہوا۔ لیکن ایک دفعہ بندشوں کے کٹ جانے کے بعد، شعراً کے ذہن آزاد تھے،

چنانچہ اس وقت تک بیسیوں شاعر ایسے پیدا ہو چکے تھے، جو قومی زندگی کے بے شمار مسائل کے علاوہ ہندو عقائد، روایات، تاریخ، مذهب اور فلسفہ وغیرہ پر بھی دلچسپ نظر میں سر انجام کر رہے تھے۔ ان شعرا میں چکیست اور سرور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن مثنوی نگار کی چیزیت سے جد آباد کے وزیر اعظم ہمارا جہ سرشن پر شاد شاد خاص مقام رکھتے ہیں۔

ہمارا جہ شاد جو اس زمانے میں شعرا کی قدر دانی اور سرپرستی کے بدب ہندوستان کے امراں میں اپنا عدل نہیں رکھتے، قدیم اور جدید شعری تحریکا کے اختلاط اور ہم آہنگی کا نہایت عمدہ نمونہ تھے۔ ان کا کلام جس کے کئی حصے شایع ہو چکے ہیں، کافی ضخم ہے اور اصناف اور مطالب کے اعتبار سے دسیع تنوع رکھتا ہے۔ اس میں چند نفیس مثنویاں بھی شامل ہیں۔ شاد کی دہ مثنویاں جو ہندو عقائد اور تاریخ پر لکھی گئی ہیں، خاص اہمیت کھلتی ہیں۔ یہ اردو شاعری میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ اس طرح کی مثنویوں میں سب سے زیادہ دلچسپ "جلوہ کرشن" ہے جو قدیم معیاروں کے مطابق لکھی گئی ہے۔ اس میں سرشن اوتار کی شاعرانہ زندگی کے حالات سلیس اور شاعرانہ انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہ مثنوی جو پڑھی ہے۔

اسی زمانے کے ایک اور اہم سمنونج حضرت بے نظیر شاہ ہیں جن کی شہرت کی بنیاد ان کی ایک انوکھی مثنوی "الکلام" ہے۔ یہ "حسن و دل" کی

طرز کا قصہ ہے جس میں تمثیل اور استعارے کے پیروی میں عرفان و ہدایت کے حقائق بیان کئے گئے ہیں۔ انسان کو عشقِ حقیقی کا رتبہ حاصل کرنے تک جو امر پیش آ سکتے ہیں، انھیں ایک فرضی عاشقانہ قصہ کا رنگ دیا گیا ہے۔ خاکے اور کردار کے اعتبار سے یہ کارنامہ، اس طرز کے قدیم تر کا ناموں پر کوئی ترجیح نہیں رکھتا۔ فوق فطری واقعات کی اس میں کثرت ہے۔ واقعات میں حیات سے مشابہت بھی کم ہے لیکن یہ واقعات پہلو دار ہیں۔ اشناص قصہ کے نام بھی خاص معنی رکھتے ہیں۔ اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی اس کے بیانات، مناظر اور مرجعوں کی سادگی ہے۔ اس لئے جدید شاعری کے اکثر اتنی بات میں اس کے پارے شامل کئے جاتے ہیں۔

اس عصر کے بلند پایہ شعراً میں حضرت اقبال کی شنویاں ایک خصوصیت رکھتی ہیں۔ موجودہ عہد اور ہر عہد کے اس شاعرِ عظم نے اردو شاعری کے ساتھ مثنوی میں بھی ایک تازہ روح پھونک دی۔ ابتداء میں وہ اس صفت کو قدیم اساتذہ کے اصول پر لکھتے تھے۔ لیکن جلد ہی ان کی طبیعت کی انفرادیت ظاہر ہونے لگی۔ چنانچہ اس کے اثر سے ان کے ہاتھ میں مثنوی موجودہ عہد کی ضروریات اور مذاق کے مطابق ہو گئی۔ جو اسلوب اقبال نے مثنوی کے لئے بعد میں اختیار کیا، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قافیہ کی ترتیب کے لحاظ سے قدیم مثنوی کے مائل ہوتی ہے لیکن تسلسلِ خیال کی مناسبت سے اس کے

لکڑے کر لئے جاتے ہیں اور درمیان میں ایک شرٹ پ کا بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بھر کی یکسانیت کم محسوس ہونے لگی اور خیال کے اتار چڑھاؤ کے لئے بڑی گنجائش پیدا ہو گئی۔ ممکن ہے کہ قدیم مذاق رکھنے والوں کو ان منسوبوں میں، اشعار کی ایک خاص ترتیب کے سوا کوئی اور فرق نظر نہ آتے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اشعار کو بندوں میں تقسیم کرنے کی یہ جدت خیال کے تسلی کی پابند ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح شرکی عبارتوں کو خیال کی رواني کے اعتبار سے پاردوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

لیکن ایک چیز ریاضت کے قابل یہ ہے کہ اقبال نے اشعار کو بندوں میں تقسیم کرتے ہوئے کسی رسمی اصول کی پابندی محفوظ نہیں رکھی بلکہ اس میں انہوں نے محض خیال کی رفتار کا لحاظ رکھا۔ اس لئے ان کے بند میں اشعار کی تعداد کبھی معین نہیں ہوتی مثلاً "بانگ درا" کی نظم "ایک پھاڑ اور گھری" دو بند پر مشتمل ہے۔ جن میں سے پہلے بند میں چار اور دوسرے بند میں چھے شعر ہیں، ہر بند کے آخر میں ایک شعر ہے۔ چار اور چھے میں تکھوڑی بہت مناسبت ہے۔ لیکن "عشق اور موت" کے پہلے بند میں صرف سات شعر ہیں اور دوسرے بند میں اس کے دو گنے۔ "صحیح کاستارہ" تین بند پر مشتمل ہے۔ جن میں سے پہلے دو بند پانچ پانچ اشعار کے ہیں اور آخری بند آٹھ شعر کا۔

اس طرح کی کئی مشنیاں اقبال نے لکھی ہیں۔ ان میں خاص طور سے قابل ذکر "خفتگانِ خواب سے استفسار" ، "سید کی لوح تربت پر" ، "انسان اور بزم قدرت" ، "رخصت اے بزم جہاں" ، "پنجاب کے دہقان سے" وغیرہ ہیں۔ ابتدائی زمانہ کی مشنوں میں جو زیادہ تر بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں، اخلاقی قصے اور کچھ فلسفیانہ نکات بیان کئے گئے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ حصہ، اور اصناف کی طرح، ان کے مخصوص فلسفیانہ خیالات تعلیم اور تلقین کا ذریعہ بن گئی۔ اقبال نے ہر بڑے اور بیگانہ رو شاعر کی طرح اپنے آپ صور شعری کا بھی غلامانہ پا بند نہیں بنایا۔ یہ محفوظ ایک سلسلہ کی بات تھی ورنہ ان کی فکر عمیق اپنے انہمار کے لئے موزوں ذریعہ بر وقت تلاش کر لینے کے رازوں سے بخوبی واقف تھی۔ وہ مشنوی لکھتے لکھتے طبیعت کی ایک اہر سے اسے، کچھ اور ہی شکل دے دیتے ہیں اور قافیہ کی ترتیب بدل جاتی ہے۔ غرض ان کی نظم اسی سانچے میں ڈھل جاتی ہے، جس طرف ان کا ذہن مائل ہو جاتا ہے۔ یوں بھی اردو شعرا نے مشنوی کے لئے فارسی کی مخصوص بحروں کا اور اسی طرح مسمط کی مختلف صورتوں کا لحاظ کم رکھا ہے۔ لیکن اس معاملہ میں اقبال سب سے آگے ہیں۔ خاص طور پر انہوں نے آخری زمانہ میں جو نظمیں لکھیں وہ روپ کے لحاظ سے اپنا آپ معیار ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ اقبال کی

فکر کا کوئی خاص انداز، کوئی خاص پہلو، کسی خاص صفت شعر سے دابتا نہیں ہے۔ شکل کی حد تک انھوں نے مٹنوی کا نہایت بے تحف اور اجمداناً استعمال کیا ہے۔ اور مطالب اور معانی کے اعتبار سے ہر خیال کو جو شاعری کے دائرے میں آسکتا ہے، اس میں ادا کیا ہے، اس شاعر بزرگ کے کلام کو، جس کا احترام ہمارے قلوب اور ہماری روحوں میں پیوست ہو چکا ہے، صور شعری کے تعلق سے دیکھنے کی کوشش، بظاہر، ایک حسین شکل کو ملکرڑے ملکرڑے کر کے دیکھنے کے مشابہ معلوم ہوتی ہے، کہ حسن دراصل کس خط اور کس زاویہ میں مخفی ہے۔ اقبال کی مٹنوی ان کی پوری شاعری بھی ہے اور جز شاعری بھی کیوں کہ ان کی فکر کی روح کے رشتے ہر صورت شعری میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن صفت کے تعلق سے ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے ہی چاہیں، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے ترکیب بندی کی ایک خاص شکل کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا جو قطعاً بھی ہے، ترکیب بند اور ترجیع بند بھی حقیقت میں قدیم صور شعری کی قیود کے خلاف بغاوت تھی۔ جن کو توطئے کے لئے اردو شعراً کی روح حاجی کے زمانے سے بے چین تھی۔ اقبال نے اسے آزاد کر دیا، اور اس کی نقل اور حرکت کے لئے ایک وسیع اور کھلی فضا تیار کر دی۔

اس میں شک نہیں کہ، اقبال نے اس جدید طرز کی مٹنوی کے

ساتھ ساتھ قدیم اسلوب کی ثنویاں بھی لکھیں لیکن ان کی جدید ثنویوں کا اثر نوجوان شعرا پر نہایت گہرا مرتب ہوا۔

اس عہد کے دوسرے سرسر آور دہ سخن پر داز جوش ملبح آبادی ہیں، جن کی شاعری میں اضافات اور خیالات کا ایک وسیع تنوع موجود ہے۔ اس زمانے کے تمام اردو شعرا کے مقابلہ میں ان کے موضوع زیادہ لطیف اور زیادہ حسین ہوتے ہیں اور ان کے اسالیب خاص طور پر چسن کارانہ ہوتے ہیں۔ لطف گویائی اور ترجمہ کے اعتبار سے جوش موحدہ زمانے کے نمایاں شاعر ہیں۔ ان کی فکر بھی اقبال کی طرح صور شعری کی زیادہ پابندی میں معلوم ہوتی پھر بھی آزاد فکر شعرا میں جوش قدیم اصولوں اور معیاروں کا خاص طور پر لحاظ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے کلام میں کئی ثنویاں ایسی ہیں جن میں اس صفت کے عام اصولوں سے تجاوز نہیں کیا گیا ہے۔ ان کے کلام کے جتنے مجموعے آج تک شایع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں کئی کئی نفیس اور مختصر ثنویاں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ”جننا کے کنارے“، ”جنگل کی شہزادی“، ”اشک اولیں“، ”گنگا کے گھاٹ پر“، ”غیرہ نہایت دلچسپ شعری نمونے ہیں۔

بعض وقت جوش کی شعری صنفیں بھی اقبال کی طرح ان کی رفتار خیال کے اثر سے خاص طور پر متاثر ہوتی ہیں اور نئی نئی شکلیں اختیار

کلمتی میں۔ ان میں بند کی شنویاں قابل ذکر ہیں۔ طویلِ نظموں کے لئے جوش نے شنوی کا استعمال ہمیشہ کیا ہے۔ اس طرح کی ایک نظم "چند جرعے" ہے جو پانچ جروعوں مشتمل ہے۔ جرعہ اول میں دس، دوم میں گیارہ، سوم میں تیرہ، چہارم میں گیارہ اور پنجم میں پھیلیں ابیات ہیں۔ اور بندیا جرعہ کی آخری بیت کو وہ ٹپ کے شعر کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور بیت دھراتے ہیں۔ ان کی ایک چھوٹی سی شنوی "جمنا کے کنارے" اساتذہ قدیم کی بحروف میں لکھی گئی ہے۔ شنوی کے کچھ شعر دیج ذیل ہیں۔ اس میں قیدم شنویوں کا پورا آہنگ ہے :

خورشید طلوع ہو رہا ہے
افسانہ شروع ہو رہا ہے
جلووں کی ہے چھوٹ خار خس پر
رقاص ہے شعاع ہر کس پر
رہ رہ کے چھلک رہا ہے پیغم
ہر ذرہ خاک داں عالم
گردوں کی جیں چمک رہی ہے
پودوں کی کمر لجک رہی ہے

جائے ہیں طیور پھپتاتے
 چونکے ہیں حسین نسماتے
 مکھڑوں پہ لئے بھد بھلی
 شبِ نعم کی نمی صبا کی خنکی
 پونچھیں منہ کو اگر ذرا بھی
 ردمال میں چھوٹ آتے سرخی

پہ منظر طویل ہے اور آگے مزید تفصیل لکھی ہے۔ تقریباً تمام متنویاں فکر اور اسلوب ہر چیز سے پڑھنے اور لطف انداز ہونے کی چیزوں ہیں۔ جوش کے کلام سے تنزیروں کو علاحدہ کر کے اکٹھا کیا جائے تو ایک اچھا خاصاً فتحم مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔

امجد حیدر آبادی جواردو کے خصوصی ربانی گو شاعر کی چیز سے لازوال ثہرت رکھتے ہیں، کبھی کبھی غزل اور متنوی کی طرف بھی توجہ کرتے ہیں۔ ان کی ربانی کی عام خصوصیات یعنی اخلاق اور تصوف کے نکات، زبان کی سلاست، گفتار کی ندرت ان کی متنویوں میں بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ متنویاں زیادہ تر ابتدائی زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں اس لئے ان کا خاص رنگ ان متنویوں میں بہت پختہ نہیں ہوا ہے۔ یہ متنویاں چھوٹی اور اخلاقی ہیں اور ”ریاضِ امجد“ کے نام سے امجد کی نظموں کا جو

اولین مجموعہ شایع ہوا تھا، اس میں یہ شامل ہیں ۔

یہاں اکبر آبادی استاد شاعر، جن کی نظر شاعری کے لواز مہ پر گھری ہے، مولانا روم کی شنوی کے اپنے اردو ترجیح کی وجہ سے جو "الہام منظوم" کے نام سے موسوم ہے، شنوی بگاروں کی صفت میں بھی اپنا مقام رکھتے ہیں۔ جدید عہد کے اکثر شاعر، جو اقبال سے خاص طور پر متاثر ہیں اور فکر سخن کے لئے اپنے اسالیب اور نئے نئے طرز خیال کی بدائل میں خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ ان میں حفیظ جالندھری کا نام اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے۔ حفیظ نہ صرف اچھی غنائی نظمیں سر انجمام کرنے میں شہرت رکھتے ہیں بلکہ ان کا کارنامہ جو شنوی کی صفت میں ہے، جدید دور کے افکار میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ یہ کارنامہ "شاہ نامہ اسلام" کے نام سے موسوم اور مشہور ہے، اور غالباً جدید دور کی طویل ترین اردو نظم ہے۔ اس کا موضوع اسلام کے عربج کی تاریخ ہے۔ کیسی نظم کے لئے بھی ایک بہت وسیع موارد تھا۔ لیکن حفیظ نے نہایت ذوق اور جانشناختی سے موارد کے مطابق اس کی تنقیح اور انتخاب کا فرض انجمام دیا اور عام واقعات سے شاعرانہ پہلوؤں کو مستحب کرنے اور پھر ان کی ترتیب میں پورے شاعرانہ ذوق اور سلیقہ کا ثبوت دیا ہے۔ یہ بسیط نظم چار جلدیوں پر حاوی ہے اور اپنی تکمیل اور شعری محاسن کے علاوہ ایک مکمل سمجھویز ہے اور اپنے مختلف مراحل ارتقاء کے اعتبار سے ایک یادگار

کارنامہ ہے۔

قدمانے شنویوں کے لئے عام طور پر جھپوٹی جھپوٹی بھر مخصوص کر لی تھیں۔ لیکن حفیظ نے ”شاہ نامہ“ کے لئے خاصی طویل بھر انتخاب کی ہے۔ اس کے باوجود ان کی مشاق طبیعت کو ایک خاصی طول طویل نظم سراجیم کرنے میں کہیں دقت واقع نہیں ہوئی۔ حفیظ کا یہ مذاق اور یہ اہمیت موجودہ زمانے کے شاعروں کے لئے بھی ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔ اس طویل بیانیہ نظم میں شاعرانہ پیش کش کے لحاظ سے جو ہماری ہے، ایسی طویل نظموں میں کم ملتی ہے۔ ذیل میں حضرت اسماعیل کے صحرائے عرب کی طرف سفر کا ذکر اور اس وادی غیرذی زرع کا نقشہ جو نظم کے عمدہ پاروں میں سے ہیں، نقل کیا جاتا ہے۔

خدا کے حکم سے مسل نے جب رخت سفر باندھا
جناب ہاجرہ نے دوش پر لخت جگہ باندھا
پیمبر اپنا بیٹا اور بیوی ہم عنان لے کر
چلا سوئے عرب پیری میں نخت نوجوان لے کر
خدا کا قافلہ جو مشتمل تھا تین جانوں پر
معزز جس کو ہونا تھا، زمینوں آسمانوں پر

چلا جاتا تھا اس پتے ہوئے صحرائے کے پینے پر
 جہاں دیتا ہے انسان موت کو ترجیح جینے پر
 وہ صحرائے کا سینہ آتشی کرنوں کی بستی ہے
 وہ مٹی جو سدا پانی کی صورت کو ترسی ہے
 وہ نقشہ جس کی صورت سے فلک بھی کانپ جاتا ہے
 وہ صحرائے کی وسعت دیکھنے سے ہول آتا ہے
 جہاں اک اک قدم پر سو طرح جانوں پر آفت لکھی
 یہ چھوٹی سی جماعت لبس دہیں گرم مسافت لکھی
 بالآخر چلتے چلتے آخری منزل پر آٹھرے
 پئے آرام نزدِ دامنِ کوہِ صفا ہڑے
 یہ دادی جس میں وحشت بھی قدم دھرتی لکھی ڈرڈر کے
 جہاں پھرتے لکھے آوارہ تکھیرے بادِ صحرے کے
 وہ دادی جو بہ ظاہر ساری دنیا سے زالی لکھی
 یہی اک روز دینِ حق کا مرکز بننے والی لکھی
 وہ دادی جس میں سبزہ تھا نہ پانی تھا نہ سایہ تھا
 اسی کی جستجو میں اس طرف پیغمبر آیا تھا

یہیں نفع سے اسمعیل کو لا کر بسانا تھا

یہیں اپنی جبینوں سے خدا کا گھر بسانا تھا

اس عہد میں دو مشنویاں خاص اہتمام کے ساتھ لکھی گئیں۔ یک مشنوی ہیں لیکن یہ اپنے عہد کے مسائل سے متعلق ہیں۔ ان میں سے ایک مشنوی شاعرِ عظیم آبادی کی "مادر ہند" ہے اور دوسری پنڈت برج موہن دتا تریکھی کی "جگ بیتی"۔ "مادر ہند" اس عہد کے قومی اور وطنی جذبات کی آئینہ را رہے۔ اس کا آغاز "سرزمین ہندوستان" کے عنوان سے ہوتا ہے اور اس میں حب وطن کے جو جذبات ظاہر کئے گئے ہیں وہ حالی کی مشنوی "حب وطن" کا آہنگ رکھتے ہیں۔ مشنوی میں فرقہ دارانہ آشٹی اور محبت کا درس ایک رمز کے انداز میں دیا گیا ہے۔ شاعر نے دو عظیم فرقوں کے نمائندے رام اور رحیم چنے ہیں جنکی وجہ "مادر ہند" کے دولاد لے فرزند" کا نام دیتے ہیں۔ ان دونوں کے آپس کے نفاق سے ملک کو جونقصان پہنچ رہا تھا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عیش آ کے ہوا شریک محبت رہتی تھی سدا جلیس غفلت

پیدا ہونی دل میں اس قدر کر ذاتوں کے بچار کی نہ تھی صد

آزادی دمطلق العنانی اس دور میں ہو گئی ناگہانی

"جگ بیتی" ایک سماجی موضوع ہے جس میں ایک کمسن بیوہ جانکی کے

سانحات کو پیش منظر میں لا کر اصلاح کا جذبہ ابھارنے کی کوشش کی گئی۔ اس شنوی کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اس میں بھر بدلتی جاتی ہے۔ مثلاً:

مشہور ہیں کم ثنویاں اپنی زبان میں
جو ہیں وہ ہم آہنگ ہیں موضوع و بیان میں

جو گی جس کی کٹیا کے پاس پہلے ہم جانکی سے رد ناس ہوتے ہیں، اس کا تذکرہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

نھا اک مقام فنا جس کی دل بھائی کھی
ادا سے جس کی پھین دل میں سمجھی جاتی کھی

یہ شنوی اصلاحی اور اخلاقی ہے۔ اس میں رطف زیادہ نہیں، لیکن اس میں کیفی کی جدت طراز طبیعت نے بہت سی ندرتیں پیدا کی ہیں۔

موجودہ دور میں شنوی لکھنے کا طریقہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ مختصر طور پر بھی مشہور شعرا کی شنویوں کا یہاں ذکر کیا جائے تو یہ سلسلہ بہت طویل ہو جائے گا۔ ہر شاعر کے کلام میں چند اجنبی، مگر مختصر شنویاں ضرور موجود ہیں۔ اور اس میں وہ غنائی، بیانیہ، اخلاقی، توضیحی، فلسفیانہ، غرض شاعری کے ہر اس مضمون کو بلے تکلف استعمال کرتے ہیں جو شعر کے دائرہ میں آسکتا ہے۔ جدید شاعری میں ”نظم“ کی اصلاح کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے، وہ عموماً شنوی کی بدولت ہے۔

بعض بعض شاعروں کے کلام سے ایک اور رجحان بھی خاص طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ عربی فارسی کے ناموس الفاظ، ترکیبیوں، استعاروں اور میحوں کو ترک کر کے ان کی جگہ سلیس ہندی الفاظ، محاوروں اور ترکیبیوں کے استعمال اور تردد تصحیح کی کوشش ہے۔ اس سے ان کا مقصد اردو شاعری کو حقیقی ہندوستانی شاعری بنانا ہے۔ متوسط دور میں نظیر اکبر آبادی نے یہ اصول اختیار کیا تھا۔ لیکن اس وقت اردو شاعروں کے ذہن پر فارسی کے اثرات غالب تھے۔ اس لئے ان کی کوشش کو عامیانہ اور پھپھورا پن سمجھا گیا۔ بعد میں عنطرت اللہ خاں کی دلچسپ نظموں نے اس مکتبِ خیال کو خاطر خواہ تقویت کی تھی۔ اور اب یہی چیز ایک ترقی پر ور رجحان سے تعبیر کی جا رہی ہے۔ اب نہ صرف اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے بلکہ اصول شاعری اور زکروں کی حد تک بھی قدیم ہندی شاعری سے خاطر خواہ استفادہ کیا جا رہا ہے۔ موجودہ شعرا میں اختر احسان، روشن، میراجی اور کئی شاعر، اس مکتبِ خیال کے ٹرے علمبردار ہیں۔

بظاہر یہ ایک جدید تحریک نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک جمعت پسندی ہے جس کو انگریزی شعرا کی تحریک "فطرت کی طرف والی" یا "نرمی میں قا آنی" کی تحریک سے ٹری حد تک مشابہت ہے۔ اس تحریک کے پہلے میں بہرہ عروج کے کافی قرائیں موجود ہیں اور جب یہ تحریک ارتقاء کے پڑے مرنے میں کرے گی تو اردو کی جدید ترین شاعری قدیم ترین اور

خاص طور پر دکھنی دور کی شاعری تے قریب تر ہو جائے گی۔

ہمارے زمانے میں طویل مشنوں اور منظوم داستانوں کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ ہمارے شاعروں کے ذہن اپنے عہد کے گوناگوں مسائل سے بردگز ماہیں اور نئے خیالات اور ان کے رد عمل کے طور پر نئے سانچے شعروادب کے تیار ہو رہے ہیں۔ اگلے دور کے شاعروں کی طرح کے اب بہت کم سخن سخن ایسے ہیں جو صفت کا تعین کر کے شعر کرنے پڑھتے ہوں۔ موضوع اور شاعر کا سود دراصل، اس کے سانچے تیار کر لیتا ہے۔ اس اعتبار سے مشنوی یا کوئی اور صفت شعر میں اب قدیم اہمیت کی حامل نہیں رہی۔ بے قافیہ نظام اور آزاد نظام کو چھوڑ کر کبھی، قافیہ کی ترتیب کے لحاظ سے ہماری موجودہ شاعری اتنا وسیع تنوع پیش کرتی ہے کہ اس کی ضابطہ بندی آسان نہیں۔ مثال کے طور پر فیض احمد فیض ہمارے زمانے کے مشہور ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کے یہاں با ضابطہ مشنوی کی شکل کی کوئی نظم نہیں ملتی، اور کوئی اور شعار کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن اس کا یہ طلب نہیں کہ یہ صفت اور قافیہ کی یہ سہل اور آسان ترتیب جدید نظموں کے اور سخن سخنوں کے لئے جاذب توجہ نہیں رہی۔ آج کا شاعر اگر سعی سے کوئی نیاروپ اختیار کرنا بھی چلہے تو اس کے لئے وسیع گنجائش ہے۔ لیکن بہت سی نظمیں اس زمانے میں مشنوی کی صفت میں بھی ڈھل گئی ہیں۔ مثال کے لئے ظہیر کا شیری کی نظم "زریکی" پیش کی جا سکتی ہے۔ مختصر سی نظم ہے اس لئے یہاں مکمل نقل کی جاتی ہے:

جھعن جھعن گھنگھر و گھنکارے چونک اٹھے فلنال تارے

تان اڑی مسی مکائی چوٹی ناگن سی لہرائی
 کوندگئے آنکھوں کے اشارے
 جاگ اٹھے کا جل کے دھارے
 خود ہنس کر پتو ڈھلکا یا
 بھکی سی اک تان اڑا کر
 سابخہ ذرا ہولے جھنکا کر
 اڑی کے بل پر لہرائی
 داد ملی گردن نیوڑ رائی
 پھر دونوں کو لھے مٹکا کر
 محفل پر آنکھیں بکھرا کر
 سیندوڑی آنجل بھیلا یا
 جھم جھم، جھم جھم تال بتا یا
 اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تو پھی مرقوں کی نظموں اور مختصر بیانوں
 کے لئے مثنوی کی ضرورت اور افادت اب بھی گھٹی نہیں اور کبھی نہیں گھٹائی جا سکے
 گی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب مخفی بزمیہ انداز کی داستانیں،
 مثنوی سے کنارہ کش ہو چکی ہیں۔ سو اس کے کہ پنڈت کیفی کی طرح کوئی نئی
 اتنی کا قصہ سر انجام کرنے کے لئے تیار ہو جائے اور وہ مخفی بیانیہ نہ ہو۔ بلکہ معاصر
 زندگی اور اس کے مسائل یا کسی بلند فلسفیانہ اور علمی اور ادبی مقصد کے لئے قصہ
 کا مانا بانا تیار کیا جائے اور اگر اس میں قدیم اساتذہ کا حسنِ گفتار بھی موجود ہو
 تو مثنوی پھر ایک نئی زندگی حاصل کر سکتی ہے اور اس کا خالق صرف ایک
 کارنامے کی بدولت تاریخِ ادب میں نایاں مقام حاصل کر سکتا ہے۔

مطبوعات ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

سیاست

ڈنیا کی گوئیں (اردو کانٹی ٹرائی ٹریوشن) ۱۰/-
اصول سیاست (پرنسپل آف پولیٹیک) ۱۰/-
جہوریہ بند کانٹی ٹرائی ٹریوشن آف ایڈیشن ۱۰/-
بادی سیاست (ایڈیشن کامپیکشن) ۱۰/-

متفرق

مول تسلیم ڈاکٹر ضیاء الدین ھٹھی ۲۵/-
بعد ایک سال ڈاکٹر ضیاء الدین ھٹھی ۱۰/-
اعظم افغان کے اصول حیدر شریف خلی ۲۰/-
تکمیل افغان کے بیانی مول جعفر شلیل تعالیٰ افغان ۱۰/-
تعلیم سیاست کے زامنے سنت نانی ۱۰/-
بعد علم ساض دنیا سیمین ۳۰/-
رہبر حضرت سنت نانی ۲۰/-
دہیر شریت سنت نانی ۲۵/-
علم خانہ خاری سنت نانی ۲۵/-
چوکی لی تریت سنت نانی ۲۵/-
محمد سخا من اخواز پرانی ڈاکٹر ھری خان ۱۰/-
تغیریں بالاخت وہاب شریف ۲۰/-
معتمد فر ڈاکٹر افضل اللہ ۱۰/-
اُردو فون ڈاکٹر احمد رضا ۱۰/-
اور ڈیکٹر رہنی کے ذریعہ بیکھنے ۱۰/-
اکٹش ڈائیلیشن کیمپین ایڈیشن ۲۰/-

تاول اور افانے

حصت بان (تاول) قائم ہبھتہ ۹۰/-
چار تاولٹ (تاولٹ) قریبیں ہبھتہ ۱۰/-
آخر شبکے ہبھتہ ۱۰/-
روشنی کی رفتار (فلان) ۱۰/-
راجمند خلہ بیکھر کی افانے ۱۰/-
کاشن چنطہ ملکہ کی افانے ۱۰/-
بھٹے پسندیدہ افانے ۱۰/-
اڑو کے تیرہ افانے ۱۰/-
سغتوں کے نائندہ افانے ۱۰/-
مشدی (تاول) حصت پختان ۱۰/-
پرمیں کے نائندہ افانے رتبہ ڈکٹر ٹیکس ۱۰/-
نائندہ مخترا افانے سچہ گھلطہ بھر کی افانے ۱۰/-
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی رائٹ، ملی گھٹہ

تسویریں اپالوں کی (غلکے) نور الحسن نقوی ۱۰/-
نذرِ عالم کے تاول ڈکٹر اخلاق حمد غال ۸۰/-
محول گورنیشوری: حیات ادبی خدات

ڈاکٹر شاہین فذ دوس ۲۵/-
اڑوں ترقی پسندادی ٹھریک فیصل ارجن انٹی ۱۰/-
کچھ تطبی کو مقلے آل احمد سرور ۱۵/-
خواب باقی میں (خودو شست) آل جوہر ۲۰/-
دشواحمد مرتضیٰ کے خلوط آل محمد سرور ۱۵۰/-

فکر روشن آل محمد سرور ۱۰/-
وہو تو ٹھریک آل جوہر ۲۰/-
اوکا کام کے دینے تک احمد سرور ۲۰/-
ہر سلی سوک رناہلی ہبادی ۱۵/-
شیر دریا حائل ہبادی ۱۵/-

فن تقدیار و تغیری ڈاکٹر نور الحسن نقوی ۲۵/-
اڑو و نشر کا تقدیم مطالعہ سینل بھار ۱۵/-
اڑو شامی کا تقدیم مطالعہ سینل بھار ۵۰/-
واسستان تاول اور افانے در داش قماگی ۳۰/-
اُردو مخفاقانہ نگاری کی تغیری پرین لاطر ۱۰۰/-

اڑو ادب کی تایخ ڈاکٹر الجی بیاندی ۳۰/-
تایخ ادب اردو وزاکن نقوی ۵۰/-
خود ناول کی تایخ و تغیر ملی ہیاس سینی ۴۰/-
اڑو دنماکی تایخ و تغیر فرشت رحلان ۹۰/-
دکنی ادب کی تایخ علی الحسن قادری تقریر ۶۰/-

اُردو تغیری نگاری سرتباً اپنی اشرف ۲۱۰/-
اُردو مخفاقانہ نگاری سرتباً اپنی اشرف ۲۱۰/-
تاول کافن تصحیح ابوالکلام قاسمی ۳۵/-
ہر دو صنوی کا ارتقا جلد القادر سروری ۲۰/-

اردو تغیری کا ارتقا جمادات بریوی ۵۰/-
فن افتاب نگاری دقاد عظیم ۳۰/-
نیا افتاب دقاد عظیم ۳۰/-
وائلکلن سے اخیانہ سکھ و قادر عظیم ۵۰/-

ارفعی کے ترھاں سلیمان حسین ۲۰/-
میں مدد علی ڈکٹر جناب علی ہمیں ۱۰/-
ہر ہزار ڈالیں ہو دیجہ تحریر نگار خدا ۲۰/-
قدور خروشانہری مقدر ڈاکٹر وحید علیش ۳۰/-
ہر ہزار ڈالیں ہو دیجہ تکمیں کاک ۳۵/-

پھر و لکھ مال تعدادیں احمدی ۲۰/-
شہی گل دلیم سعد قریبی فریدی ۲۰/-
مشنی گل دلیم تعدادیں احمدی ۲۰/-
۱۳۰/-

اقبالیات

کیات اقبال مصلک ایڈیشن ۱۰/-
ڈاکٹر اقبال آل عکسر ۱۰/-
اقبال پیغمبر شاہر رسمیہ ہدین ہائی سلیمان ۱۰/-
اقبال شاہر و خطر نور الحسن نقوی ۱۰/-
اقبال فی بہر کلہ نور الحسن نقوی ۲۰/-
لکھنؤ ہبادی ٹکمہ ستر طہران اقبال ۱۰/-
بانگل و را ٹکس ڈاکٹر اقبال ۲۰/-
مل بھل مکس ڈاکٹر اقبال ۲۰/-
مرب کیم مکس ڈاکٹر اقبال ۲۰/-
ارضانی ہجا زارہ و ٹکس ڈاکٹر اقبال ۱۰/-

نحالیات

دیوان ہباد مخدود نور الحسن نقوی ۳۰/-
غائب ٹھنڈا شاہر بخون گورنیشوری ۳۰/-
ٹاکٹ شہزادہ سکھ نور الحسن نقوی ۳۰/-

سرستیہ

سریدہ محمد غال اور ان کا جسد ٹریائیں ۲۰/-
ہادم سہیت احمد غال عیناً ۹۰/-
سرستیہ اور العکے ٹاہمہر ناظم سید جہاد اللہ ۹۰/-
انقلاب مہاں سہیت آل احمد سرور ۲۰/-
سہیت ایک گماں سرفیٹ ٹھیکن ہجوم ناظمی ۵/-
سہیتہ اور اس کے کارنامے نور الحسن نقوی ۱۵/-

فیض

علم میں ٹکس ٹیکن ہفیض ۵۰/-
نقش فردی ٹکس ٹیکن ہفیض ۱۰/-
دھرم صہی ٹکس ٹیکن ہفیض ۱۰/-

لسانیات

خدر کا یک زینہ مدد ڈکٹر سوہنیہ ۶۰/-
مردوں کا ہمیل ہائی ڈکٹر اخیانہ ہمیگ ۱۰/-
خوکی جاتی لیکل ڈکٹر مہمن خیل عینیگ ۱۰/-
قدوہ لسانیات ڈکٹر ٹوکت سبھدی ۲۰/-

ادب و تحقیقہ

ٹھریک کی تغیری رہیز جا الکلام قاسمی ۱۰/-
قده کی کے ہر یہ بورنی ٹکس نور الحسن نقوی ۲۰/-